ماہنامہ

بہاول نگر

سرائے اُردو

اگست 2022ء

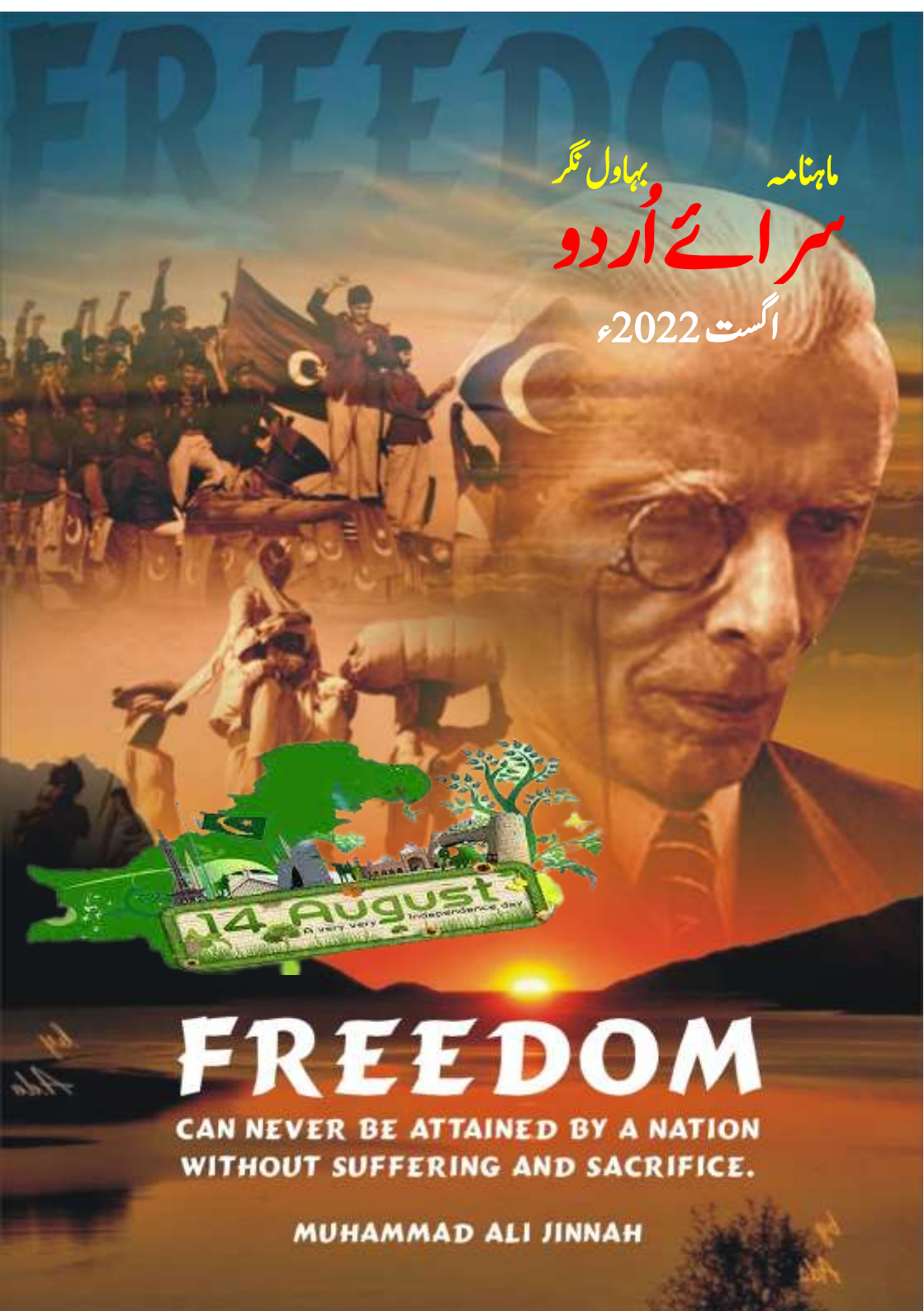

فہرست

مدیر کا صفحہ	دانیال حسن چغتائی	2	تجدیدِ عہدِ وفا کا دن	دانیال حسن چغتائی	45
اداریہ	بہرام علی وٹو	3	حقیقی خوشی	محمد طیب صدیقی	48
حمدِ باری تعالیٰ	انتخاب: فاکہہ قمر	4	آزادی کا سفر	عبدالحفیظ شاہد	51
نعت رسولِ مقبول ﷺ	عمار حسین	4	اصل آزادی	مریم اقبال	55
وطن کی محبت	بنیش احمد	5	آزادی کا جھنڈا	ہانیہ ارمیا	61
ہم عہد کرتے ہیں	مریم شہزاد	7	عظیم قربانی	صغریٰ یامین	64
راوی کنارے	عطاء السلام سحر	9	شانِ حضرت عثمانِ غنی	ارسلان اللہ خان	66
آزادی	حفید سلطان	11	یہ پیارا وطن	آستر رندھاوا	67
احساس ذمہ داری	آمنہ یاسین	12			
سیف اللہ نے جھنڈا لگایا	ہادیہ امین	13			
آزادی	ذوالفقار علی بخاری	18			
حب الوطنی	فاکہہ قمر	20			
آزادی کا سفر	حمیرا حلیم	23			
دنیائے ادب کا ابھرتا ہوا روشن ستارہ: صبا اظہر	تحریر و ملاقات: فاکہہ قمر	26			
آخری جنگ	ہوید اصالح	33			
پاکستان زندہ باد	کفایت اللہ	38			
تحریکِ پاکستان کا ایک گمنام سپاہی	ملک محمد احسن	39			
میرا ملک پاکستان ہے (نظم)	ارسلان اللہ خان	41			
لاوارث خط	بہرام علی وٹو	42			
انوکھا جشن	ثمرین مسکین	43			

مدیر کا صفحہ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

معزز قارئین امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ پچھلے ماہ کا شمارہ جو عید الضحیٰ کے حوالے سے تھا، ہم نے رنگا رنگ تحاریر سے سجا کر آپ کے سامنے پیش کیا تھا اور الحمد اللہ آپ سب نے اسے خوب پذیرائی بخشی تھی۔ یہ شمارہ آزادی کے حوالے سے تحاریر سے آراستہ کیا گیا ہے اور امید ہے کہ آپ سب کی توقعات پر پورا اترے گا۔

آپ سب کو وطن عزیز پاکستان کی پچھترویں سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس جان سے پیارے وطن کو سدا شاد و آباد رکھے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے قول و فعل سے اسے حقیقی معنوں میں قائداعظم کا پاکستان بنائیں۔

پاکستان زندہ باد!

والسلام

دانیال حسن چغتائی

اداریہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمام قارئین کو ہماری ٹیم کی طرف سے آزادی کی ڈھیروں مبارک باد۔

ہمیں آزادی حاصل کئے 75 سال ہو گئے ہیں لیکن ملک عزیز آج بھی بہت سی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ ملک ایک درست سمت کی طرف گامزن ہوتے ہوتے مختلف بھول بھلیوں میں گم ہو تا جا رہا ہے جو کہ ہم سب کے لیے بہت بڑا المیہ ہے۔ ہمیشہ زندہ قومیں مل کر اپنے ملک کو اوپر اٹھاتی ہیں۔ ہم بھی آج عہد کریں کہ ہم بھی زندہ قوم کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ملک پاکستان کو اپنے ملکی اداروں کے شانہ بشانہ کھڑا ہو کر کامیابی کی نئی راہ پر لے کر جائیں گے کیونکہ ہمارا ملک ہی ہماری اصل پہچان ہے۔

ہمارے بزرگوں کی لازوال قربانیاں یوں رائیگاں نہیں جانی چاہیے۔

آج ملک پاکستان کی ترقی میں بہت سے اندرونی اور بیرونی سازشیں حائل ہیں۔ ان سازشوں کا مقابلہ ہم سب نے مل کر کرنا ہے تاکہ ملک عزیز ترقی کی نئی تاریخ رقم کر سکے۔ آج تمام پاکستانی مل کر یہ نعرہ بلند کریں۔

ہم زندہ قوم ہیں۔۔۔۔۔۔پائندہ قوم ہیں۔۔۔۔۔۔

پاکستان زندہ باد!

والسلام: بہرام علی وٹو۔ مدیر: سرائے اردو بہاول نگر

منتظمِ اعلیٰ: ذوالفقار علی بخاری

مدیرِ اعلیٰ: دانیال حسن چغتائی

مدیر: بہرام علی وٹو

ڈیزائننگ اینڈ کمپوزنگ: محمد طیب صدیقی

حمدِ باری تعالیٰ

انتخاب: فاکہہ قمر

تجھی سے ابتدا ہے، تو ہی اک دن انتہا ہو گا
صدائے ساز ہو گی اور نہ سازِ بے صدا ہو گا
ہمیں معلوم ہے، ہم سے سنو محشر میں کیا ہو گا
سب اس کو دیکھتے ہوں گے، وہ ہم کو دیکھتا ہو گا
سرِ محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہو گا
در جنت نہ وا ہو گا، در رحمت تو وا ہو گا
جہنم ہو کہ جنت، جو بھی ہو گا فیصلہ ہو گا
یہ کیا کم ہے؟ ہمارا اور ان کا سامنا ہو گا
ازل ہو یا ابد، دونوں اسیر زلف حضرت ہیں
جدھر نظریں اٹھاؤ گے، یہی اک سلسلہ ہو گا
یہ نسبت عشق کی بے رنگ لا رہ نہیں سکتی
جو محبوب خدا کا ہے، وہ محبوب خدا ہو گا
اسی امید پر ہم طالبانِ درد جیتے ہیں
خوشا! درد دے کہ تیرا درد، درد لا دوا ہو گا
نگاہ قبر پر بھی جان و دل سب کھوئے بیٹھا ہے
نگاہ مہر عاشق پر اگر ہو گی تو کیا ہو گا
یہ مانا بھیج دے گا ہم کو محشر سے جہنم میں
مگر جو دل پہ گزرے گی، وہ دل ہی جانتا ہو گا
سمجھتا کیا ہے تو دیوانگانِ عشق کو،
زاہد! یہ ہو جائیں گے جس جانب، اس جانب خدا ہو گا
جگر کا ہاتھ ہو گا حشر میں اور دامن
حضرت شکایت ہو کہ شکوہ، جو بھی ہو گا برملا ہو گا

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

عمار حسین

پروانہ جو بھی شمع رسالت سے دور ہے
منزل سے دور نور ہدایت سے دور ہے
ذکر نبی سے چشم ہی روشن نہیں
فقط دل کا یہ آئینہ بھی کدورت سے دور ہے
جس دل میں آرزوئے مدینہ نہیں
وہ دل مولائے کائنات کی رحمت سے دور ہے
ہے جس کے سائے دامان مصطفی
سمجھو کہ وہ ہر ایک مصیبت سے دور ہے
عمار ہوا ہے جب سے در شاہ کا غلام
دنیائے مال و زر کی محبت سے دور ہے

وطن کی محبت

بینش احمد-اٹک

علینہ ابھی ابھی سکول سے واپس آئی تھی- کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں سکول کا کام کرنے بیٹھ گئی تھی-علینہ کو پینٹنگ کرنے کا بہت شوق تھا-وہ کاپی نکال کر ایک تصویر میں رنگ بھرنے بیٹھی گئی تھی۔ یہ کلر پنسل علینہ کو بہت پسند تھے کیونکہ یہ اسکی سب سے پیاری دوست اور خالہ زاد اقراء نے اسکی سالگرہ کے موقعے پر تحفہ میں دیے تھے- اچانک اسکی نظر پنسل کے اوپر لکھے ہوئے الفاظ میڈ اِن چائنہ پہ پڑی تو وہ حیران رہ گئی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے یہ کلر پنسلز تو اقراء کے ابو کی فیکٹری میں تیار ہوتے ہیں تو اِن پہ کسی دوسرے ملک کا نام کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اسی کشمکش میں تھی کہ اسے پتہ چلا باہر خالہ جان اپنے گھر والوں کے ساتھ آئی ہوئی ہیں- وہ سب سے ملی اور خالو جان سے بات کرنے کی نیت سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ”مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے-یہ کلر پنسل آپ کی ہی کمپنی کے ہیں نا؟علینہ نے خالو سے استفسار کیا۔

”ہاں بیٹا! کیوں ان میں کوئی خرابی ہے کیا؟“ خالو نے اچنبھے سے پوچھا۔

”نہیں خالو یہ کلر تو بہت پیارے ہیں۔ یہ مجھے بہت پسند بھی ہیں لیکن ان پہ میڈ اِن چائنہ کیوں لکھا ہے جبکہ یہ ہمارے ملک ہی کی پیداوار ہیں“۔علینہ کی زبان پر بالآخر وہ بات آ ہی گئی تھی جس کو جاننے کے لیے وہ بے چین ہو رہی تھی۔ ”اچھا تو آپکو یہ شکایت ہے لیکن بیٹا بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ نہ لکھوائیں تو ہمارے کلرز مارکیٹ کے

معیار پہ پورا نہیں اتریں گے - آپ نے دیکھا ہی ہو گا کہ لوگ خریدتے وقت لیبل دیکھتے ہیں اگر باہر ملک کا ہو تو فوراً خرید لیتے ہیں"۔ خالو نے علینہ کی تشفی کے لیے اس کو تفصیل سے ساری صورتحال کے متعلق آگاہ کیا۔

"لیکن خالو یہ تو بہت بری بات ہے جب ہمارے ملک میں اتنی اچھی چیز بن سکتی ہے تو ہم کیوں کسی اور ملک کا نام لے رہے ہیں- ہمیں تو اپنے ملک کا نام روشن کرنا چاہیے- ہمارے ملک کے پڑھے لکھے لوگ اپنے ملک کی خدمت کرنے کی بجائے باہر ممالک میں جا کر کام کرتے ہیں- ہم لوگ اپنی چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں کہتے تو ہمارا ملک کس طرح ترقی کرے گا؟" خالو کے جواب نے علینہ کی دھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ "بیٹا! آپ کی باتیں بالکل درست ہیں آپ نے ایک سچے پاکستانی ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے- میں اپنے کئے پہ بہت شرمندہ ہوں- آئندہ میں اپنی کمپنی کی چیزوں پہ فخر سے میڈ اِن پاکستان لکھواؤں گا-" خالو کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ حد سے زیادہ شرمندہ بھی ہو گئے تھے۔ "ہمارا ملک ہمیں بہت قربانیوں کے بعد ملا ہے یہی ہماری پہچان ہے وطن سے محبت صرف جذبات تک نہیں رکھنی چاہئے بلکہ اپنے عمل سے بھی ظاہر کرنی چاہیے۔ اللہ پاک ہمارے ملک کو سلامت رکھے۔ آمین!" علینہ نے ک محب وطن کے تحت اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆

ہم عہد کرتے ہیں

مریم شہزاد، کراچی

"آج موسیٰ کی پہلی سالگرہ تھی، اس کے بہن بھائیوں نے مل کر پورے گھر کو غباروں اور رنگین پٹیوں سے سجادیا تھا۔ آپی اور بھیا نے اپنی پاکٹ منی سے مہنگا والا ہیپی برتھ ڈے لکھا ہوا بینر بھی لیا تھا اور دو لڑیاں چھوٹی چھوٹی لائٹس کی بھی لی تھیں جو کھل بند ہوتی تھی۔ شام تک پورا گھر اور سب بچے تیار ہو کر جگمگا رہے تھے، موسیٰ کو تو ابھی سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے مگر وہ جلتی بجھتی لائٹس اور رنگ برنگے غباروں کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ شام ہوتے ہی سب مہمان آنا شروع ہو گئے اور پھر کیک کاٹا گیا سب نے ہی خوب ہلا گلا کیا اور مزے کئے۔ رات کو سب کے جانے کے بعد بچے بہت تھک گئے تھے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب چیزیں کیونکہ بہت مہنگی آئی ہیں (آخر بچوں کی پاکٹ منی خرچ ہوئی تھی) تو صبح احتیاط سے اتار کر رکھ لیں گے تاکہ کسی اور کی سالگرہ پر کام آسکے لیکن دوسرے دن جب صبح وہ اٹھے تو وہ بہت پریشان ہو گئے، غبارے پھٹے ہوئے تھے لائٹس عجیب طریقے سے آدھی لگی ہوئی تھی آدھی بس گرنے ہی والی تھی، رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں فرش پر پڑی تھیں جن میں سے کچھ گیلی بھی ہو گئیں تھیں۔ بچوں کی کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ "مما، مما!! کہاں ہیں آپ؟" بھیا نے امی کو آواز دی لیکن جواب میں دادا ابو چلے آئے۔ "کیا ہوا بیٹا؟ تمہاری مما کو تو کہیں ضروری جانا ہو گیا تھا وہاں گئیں ہیں ابھی آنے والی ہی ہوں گی، خیریت تو ہے؟" "دادا ابو دیکھیں نا یہ سب، پتا نہیں کس نے ہماری چیزوں کا کباڑا کر دیا ہے۔" آپی اور بھیا نے دادا ابو کی توجہ سب چیزوں کی طرف دلائی تو انہوں نے لاپرواہی سے سب چیزوں کو دیکھا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گئے اور ایک اور غبارہ پھاڑ ڈالا۔ "ہائے دادا ابو!! یہ سب کیا آپ نے کیا ہے؟؟" بچوں نے حیرت سے پوچھا۔ "نہیں بھئی میں کیوں کروں گا، اور اگلی سالگرہ پر نیا آجائے گا سب، اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو، یہ سب تو محض کاغذ اور پلاسٹک کے ٹکڑے ہیں۔ ان کی کوئی اہمیت یا عزت تھوڑی ہے." دادا ابو اطمینان سے بولے

سب بچے چونک اٹھے۔ "کیا مطلب؟؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"مطلب یہ کہ پچھلے سال پاکستان کی سالگرہ بھی منائی تھی تم لوگوں نے، بلکہ پورے ملک نے ہی، بتاسکتے ہو کہ تم سب سمیت کتنے لوگوں نے دوسرے دن پرچم دھیان سے واپس اتار کر رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کتنی ہی جھنڈیاں کچرے میں چلی گئی تھی، اور کچھ دوسرے دن بارش میں بھیگ گئیں تھیں، بلکہ پچھلے سال کے جھنڈے بھی لوگوں کی چھتوں پر لگے لگے بدرنگ اور خراب ہوگئے تھے اب اس سال جاکر پھر نئے جھنڈے لگادیں گے تاکہ وہ بھی سال بھر بعد پھٹ کر ہی اتارے جائیں، حالانکہ ہمارا پرچم ہماری پہچان ہے ہماری عزت ہے۔ تم لوگ سالگرہ کی رنگ برنگی جھنڈیوں کے پھٹنے سے تو اتنا پریشان ہوگئے اور پرچم کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔۔۔"

"سوری دادا ابو، میں ابھی جاکر جھنڈا اتار کر لاتا ہوں۔" بھیا نے شرمندگی سے کہا۔

"اور میں اس کو دھو کر اچھی سی استری کر کے رکھتی ہوں۔" آپی بولیں۔

"بالکل کرنا چاہیے، ہمارا پرچم ہماری پہچان ہے، ہماری عزت ہے مگر کوئی سمجھتا ہی نہیں۔" دادا ابو نے کہا۔

"اچھا تو آپ نے ہم کو سمجھانے کے لیے یہ سب کیا۔" عفان نے کہا۔

"بالکل۔۔ اور اب یہ اپنے اسکول کے دوستوں کو بھی سمجھانا۔" دادا ابو نے کہا۔

"لیکن کیسے؟؟ ان کی تو سالگرہ پر میں جاکر سب چیزوں کو خراب نہیں کر سکتا۔۔" عفان پریشان ہو کر بولا۔ "ارے بیوقوف۔۔۔ ابھی چودہ اگست آنے والی ہے۔۔ تم اچھی سی تقریر لکھو اس میں بتاؤ کہ جشن آزادی منانے کے بعد پاکستان کے پرچم کو دھیان سے اتار کر رکھیں تاکہ وہ بارش، مٹی اور دھول سے خراب نہ ہو۔" دادا ابو نے سمجھایا۔

"ارے واہ۔۔ یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ میں بالکل ایسا ہی کروں گا۔۔" عفان خوش ہو کر بولا تو آپی جو ابھی پرچم دھو کر آئیں تھی۔ بولیں "میں بھی اپنے کالج میں تقریر میں حصہ لوں گی اور سب کو بتاؤں گی۔"

اور بچوں آپ بھی سب خیال رکھیں گے نا؟؟؟

☆☆☆☆

”راوی کنارے“

تحریر: عطاء السلام سحر، ڈیرہ غازی خان

”بیٹا! ہمارا کچھ پتا نہیں کہ ہم پاکستان پہنچ پاتے ہیں یا نہیں؟“ کبیر راجپوت نے اپنی بیٹیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

’بیٹا! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اپنا سفر دریا کنارے طے کریں گے۔ اگر! خدانخواستہ کہیں سے ہم پر حملہ ہو جائے اور ہم سبھی مرد جانبر نہ ہو سکیں، تو آپ نے عفت و پاک دامنی کا دامن نہیں چھوڑنا۔ اِن کتوں کے ہاتھ میں آنے سے بہتر ہے کہ دریا میں چھلانگ لگا دینا۔“ کبیر راجپوت بڑا غیرت مند اور بہادر شخص تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کی عزت و آبرو کو تار تار ہونے سے بچانے کیلئے یہ تجویز پیش کر رہا تھا۔

دو رات بھر چلتے رہنے کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جس سے چند میل آگے ہندوؤں اور سکھوں کا گڑھ تھا۔ قاتلانہ حملوں کا خوف ہر وقت سر پہ منڈلا رہا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی یہ خاصیت تھی کہ وہ تنہا حملہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ جب بھی آتے جتھے بنا کر آتے تھے۔

”آج کا دن اِسی گاؤں میں گزارنے کے بعد ہم رات کے وقت یہاں سے نکل جائیں گے۔“ کبیر راجپوت نے اپنے قافلے کو قبل از وقت آگاہ کیا۔

قافلے میں اس کے چار بیٹے، دو بھائی، تین بہنیں اور پانچ بیٹیاں شامل تھیں۔ پاکستان کی محبت انھیں پاکستان کھینچے لا رہی تھی۔ ہجرت کرنے والے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے ان کی داستانیں وہ پہلے سے ہی سن چکے تھے۔

”سامان سمیٹو! سفر کرنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔“ اس نے اپنی رعب دار آواز میں کہا۔

”دیکھیے! عورتیں درمیان میں ہی رہیں اور مرد چاروں اطراف سے گھیر اڈالے ہوئے سفر کریں گے“۔

اس نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا اور آگے آگے چل پڑا۔ شاید! کوئی پانچ، چھ میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ہلڑ بازی مچ گئی۔

"نہیں چھوڑیں گے تمھیں۔۔۔۔۔۔تم نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ ہم پاکستان آسانی سے پہنچ جائیں گے ؟۔۔۔۔۔مار ڈالو سب کو۔۔۔۔۔۔۔کمینے !رات کے وقت بھاگ چلے۔۔۔؟؟"

فصل میں چھپے بیٹھے ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے نے کرپانیں، خنجر اور برچھیاں لہراتے ہوئے کہا اور کبیر راجپوت کے قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے مل کر ان ظالموں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بالآخر کبیر راجپوت کی ایک بہن اور دو بیٹیوں کے علاوہ سب نے جامِ شہادت نوش کیا۔

زندہ بچ جانے والی بہن اور بیٹیوں نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی مگر !ناکام ہو گئیں۔

"بیٹا!اگر کہیں پر سے حملہ ہو جائے اور ہم جانبر نہ ہو سکیں تو آپ نے عفت و پاک دامنی کا دامن نہیں چھوڑنا۔ اِن کتوں کے ہاتھ میں آنے سے بہتر ہے کہ دریا میں چھلانگ لگا دینا۔" انھیں اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے ہندوئں کے جتھے دیکھ کر اپنے بابا کی نصیحت یاد آئی تو سب نے مل کر "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ کبیر راجپوت کا پورا خاندان پاکستان کی آزادی پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا تھا۔

"پیارے بچو! یہ "چودہ اگست" صرف دو لفظ نہیں! دو خاندانوں کی جدائی کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ چودہ اگست کا دن تو ہم اپنے پیارے ملک پاکستان کی آزادی کا دن مناتے ہیں۔ جس کی بنیاد میں لاکھوں لوگوں کا خون شامل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالٰی کا شکر ادا کریں کہ ہم آج آزاد قوم ہیں۔ پاکستان اللہ تعالٰی کا دیا ہوا تحفہ ہے مگر! ہم نے اِس کی قر نہیں کی۔۔۔!" سر ممتاز کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ انھوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو سمیٹا اور اسٹیج پر سے اتر گئے۔

یومِ آزادی کی تقریب اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆☆

"آزادی"

حفیظ سلطان۔ کراچی

کتنا حسین نام ہے نا یہ آزادی کتنا خوبصورت احساس ہے نا آزادی کا اور کتنا مزہ آتا ہے نا آزاد فضا میں سانس لیتے ہوئے۔ لیکن کبھی سوچا ہے کتنی مشکل سے ملتی ہے یہ آزادی

حسینوں کے حسن چلے جاتے ہیں، کتنے جوانوں کی جوانیاں خاک میں مل جاتی ہیں، کتنی دلہنوں کے سہاگ اور حسین خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور کتنے ہی قافلوں کے قافلے لٹ جاتے ہیں پھر جا کر ملتی ہے یہ آزادی۔

کہیں ماؤں کو اپنے لخت جگر کٹتے مرتے دیکھنے پڑتے ہیں تو کہیں غیرت مند باپ بیٹوں کو اپنی بہو بیٹیاں از خود قربان کرنی پڑتی ہیں پھر جا کر نصیب ہوتی ہے آزادی۔

ایک طرف تو پانی کے آخری قطرے کو ترسنے والا اپنے حصے کا پانی کسی جوان کے منہ میں انڈیل کر داعی اجل کو لبیک کہتا ہے تو دوسری طرف وہی جوان اس پانی کو جلتی ہوئی آگ پر ڈالتا ہے اور پھر لٹے پٹے قافلوں کے ساتھ اپنے ملک کو پہنچتا ہے پھر ملتی ہے آزادی۔

کتنے ہی لعل ہندوؤں کی آگ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں کتنے ہی گروہوں کو سکھوں کی تلوارِ بے نیام موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ کتنے ہی قافلے گمشدہ ہو جاتے ہیں پھر کہیں جا کر ملتی ہے آزادی۔

اتنی آسانی سے تھوڑی مل جاتی ہے آزادی۔۔۔۔ آخر یونہی تھوڑی مائی خیری نے تڑپ کر کہا تھا کہ:

"کاش پاکستان والوں کو رب پھر ہجرت کروائے تو ان کو پتہ چلے گا کہ کیا ہوتی ہے آزادی"

خدارا! اس آزادی کی حفاظت کرو اس سے پہلے کہ غلامی کی ناپاک زنجیروں میں جکڑے جاؤ۔

☆☆☆☆

"احساسِ ذمہ داری"

از قلم: آمنہ یاسین

وقت اور حالات انسان کو عمر سے پہلے ہی بڑا کر دیتے ہیں۔ کچھ محرومیاں اور زندگی کی تلخیاں بچپن کی مسکراہٹیں اور شوخیاں چھین لیتی ہیں اور پھر ذمہ داریوں کا بڑھتا ہوا بوجھ انسان کو وقت کے ساتھ ساتھ سمجھدار اور عقل مند بنا دیتا ہے۔ ذمہ داری کا احساس عمر کے کسی مخصوص حصے میں پیدا نہیں ہوتا بس حالات اور اپنوں کی فکر انسان کو ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہیں ہمیں دس، بارہ سال کے کم عمر، یتیم بچے اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے مزدوری کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں دولت مندوں کے، اٹھارہ، انیس سال کے بچے دولت کے نشے میں دھت عیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں ایک طرف غریب اور یتیم بچے کو اپنے خاندان کی کفالت کے لیے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ کڑی دھوپ میں اپنا پسینہ خشک کرنا پڑتا ہے ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ وہیں دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دولت مند باپ کا بیٹا اپنے باپ کے پیسے پر راج کرتا ہے اور اپنارات اور دن دولت اڑانے اور عیش کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اس کو زندگی میں ہر آسائش میسر ہوتی ہے۔ پس یہ دولت کی کثرت اسے غیر ذمہ دار بنا دیتی ہے۔

لیکن یہ جو ذمہ داری نبھانے کا احساس ہے، یہ جو گر کر سنبھلنے کا درد ہے اور جو ہر پل کی جدوجہد اور صبر و استقامت ہے یہ انسان کو بہت مضبوط بنا دیتی ہے اور اسے بہت بلند مقام تک لے جاتی ہے جہاں ان دولت اڑانے والوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی۔

☆☆☆☆

سیف اللہ نے جھنڈا لگایا

ہادیہ امین، کراچی

سیف اللہ کو بڑے بڑے پہاڑ دیکھنے اور ان پر چڑھنے کا بہت شوق تھا. وہ اپنے خوابوں میں کئی دفعہ ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو سر کر چکا تھا. اس کا خواب تھا کہ وہ ایک دن کسی پہاڑ کی چوٹی پر جا کر اپنا چھوٹا سا گھر بنائے گا. اگست کا مہینہ شروع ہونے کو تھا. چودہ اگست قریب تھی اسی لئے لوگ اپنے گھروں کو رنگین جھنڈوں اور جھنڈیوں سے سجا رہے تھے. سیف اللہ نے بھی اپنے گھر کو سجانے کے لئے جھنڈے اور جھنڈیاں خریدیں مگر مغرب کا وقت ہونے کی وجہ سے اس نے اگلے دن گھر سجانے کا فیصلہ کیا. اس نے مغرب کی نماز پڑھی اور پھر نماز عشاء پڑھ کے جھنڈیاں تکیے کے پاس رکھ کر سو گیا۔

"وہاں دور پہاڑ پر تمہارا گھر ہے. جاؤ! وہاں جا کر یہ جھنڈا اور جھنڈیاں لگالو"

یہ کس کی آواز تھی، یہ تو نہیں پتہ۔ سیف اللہ نے پہاڑ کی طرف دیکھا.. ایک انتہائی خوب صورت گھر سیف اللہ کا منتظر تھا. مگر رستہ بہت دشوار اور طویل تھا. کوئی بات نہیں، میں راستہ طے کر لونگا، کوہ پیمائی میرا شوق ہے اور جس چیز کا شوق ہو وہ چیز آسان ہو ہی جاتی ہے. سیف اللہ نے سوچا اور اللہ کا نام لے کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا. یہ عجیب ہی دنیا تھی. یہاں سب بول سکتے تھے. سیف اللہ کے ایک ہاتھ میں جھنڈا اور دوسرے میں جھنڈیاں تھیں. وہ دونوں کو ایک ہاتھ میں کر کے سہارا لیتا ہوا آگے بڑھا. بلندی پر جاتا ہر قدم مشکل سے اٹھ رہا تھا کی اچانک ہی کوئی چیز ہوا کی تیزی کے ساتھ سیف اللہ کے منہ پر آ کر لگی. "یا اللہ! یہ کیا ہے؟؟"

سیف اللہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "میں وہ چپس کا ریپر ہوں جو تم نے کل ہی باہر پھینکا تھا. میں اڑتا اڑتا یہاں پہنچ گیا" "اچھا! میرے منہ پر سے تو ہٹو" سیف اللہ کو شدید مشکل ہو رہی تھی۔

"نہیں، تمہارے ساتھی رہو نگا، تمہارے اس پہاڑ والے گھر تک جاؤ نگا.. کیوں مجھے کچرے دان میں نہیں ڈالا؟ نہیں چاہرہے تم میں تمہارے اس خوبصورت گھر تک جاؤں کیونکہ گھر گندا ہو گا.. کیا پاکستان گھر نہیں ہے تمہارا.. کیوں اسکو گندا کیا؟؟"

"اچھا سوری! مجھے معاف کر دو.. اب یہ غلطی نہیں ہو گی، ہٹ جاؤ، میرا یقین کرو مجھے کچھ نظر نہیں آرہا"

سیف اللہ پریشان تھا. اسکے یہ کہتے ہی ریپر ہٹ گیا۔

سیف اللہ کو دکھائی دینا شروع ہوا. وہ اور آگے بڑھا. جیسے جیسے زمین دور ہو رہی تھی، ویسے ویسے گھر قریب آرہا تھا. کوشش اور خوشی دونوں بڑھتی جارہیں تھیں. اچانک شور سا اٹھا

"رک جاؤ! رک جاؤ! پہلے ہمیں پانی دو، ہمارا پانی واپس کرو"

یہ بہت سارے لوگ تھے. ان کے ہاتھوں میں خالی بوتلیں اور بالٹیاں تھیں. ساتھ چھوٹے بچے بھی تھے جو پیاس سے نڈھال لگ رہے تھے. سب ہی کا بہت برا حال تھا..

"میں نے نہیں لیا تمہارا پانی، تم لوگ کون ہو، یہاں کیسے چڑھ گئے؟"

سیف اللہ گھبرا رہا تھا. ایک تو راستہ مشکل.. اوپر سے ایک اور مشکل.. اور مشکل کے بعد پھر مشکل۔

"ہم تمہارے پہاڑ والے گھر کے ساتھی رہتے ہیں اور پاکستان بھی تمہارا گھر ہے. جھوٹ نہ بولو.. جو ڈھیر پانی تم نے وضو کرتے ہوئے ضائع کیا تھا وہ ہمارا پانی تھا. تمہیں میسر تھا تو تم نے ضائع کر دیا.. ہمیں پینے کا پانی بھی میسر نہیں.. اور تم دیکھ رہے تھے کہ تمہارے ابو کی گاڑی صاف کرنے والے انکل صاف گاڑی کو بھی اتنا پانی بہا کر دھوتے ہیں مگر تم کچھ نہیں کہتے.. تمہارے گھروں میں ٹنکیاں بھر بھر کے بہتی ہیں مگر تم کچھ نہیں کرتے.. تمہارے گھر میں کپڑے برتن دھلتے وقت اتنا پانی ضائع ہوتا ہے کہ کئی لوگوں کو کافی ہو جائے، مگر تم دیکھتے ہو اور کچھ نہیں کہتے.. تم قصوروار ہو ہمارے پیاسے ہونے کے.. ہم نہیں جانے دینگے. تمہارے گھر میں بھی

پانی نہیں ہے.. تم نے سب بہا دیا.. کیوں پاکستان کا اتنا خیال نہیں ہے جتنا اس پہاڑ والے گھر کا ہے؟"سب لوگ ناراض تھے. کچھ تو رو بھی رہے تھے.. سیف اللہ خود بھی رونے لگا.. لوگوں کی ہر بات درست تھی، ہر اعتراض بجا تھا. مگر وہ سخت مشکل میں تھا.. واپس جانا بھی مشکل، آگے بڑھنا بھی مشکل..

"میرا وعدہ ہے، آئندہ نہ میں خود پانی ضائع کرونگا، نہ کسی کو کرنے دونگا.. پانی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اور ہم لوگ اسکی بہت ناقدری کرتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ ایک ایک قطرے کا حساب ہو گا"

"ٹھیک ہے، جاؤ"۔ سب لوگ چلے گئے.. ایک بچے نے تو جاتے ہوئے سیف اللہ کو دھکا بھی دینا چاہا مگر اسکی امی نے روک لیا.. "نہیں بیٹا، وطن کے دشمنوں سے لڑتے ہیں، وطن میں رہنے والوں سے نہیں. انکو بلندی پہ جانے دو اور ان کے لئے دعا کرو"سیف اللہ بچے کے دھکے سے ڈر گیا. اگر دھکا لگ جاتا تو سیف اللہ خواب میں پہاڑ کے اور حقیقت میں بستر کے نیچے ہوتا.. وہ اور آگے بڑھا.. بڑھتا گیا.. راستے میں اسکو کوئی چیز اڑتی دکھائی دی.. "یہ کیا چیز ہے! میں ان سے آگے کیسے بڑھوں گا؟"اس نے دل میں سوچا۔

"ہم چاول کے دانے ہیں.. ہم منے منے نوالے ہیں.. ہم روٹی کے ٹکڑے ہیں.. ہم اللہ کا وہ رزق ہیں جس کا ادب ضروری تھا.. ہمارے ذریعے کئی لوگوں کا پیٹ بھر سکتا تھا.. مگر آپ نے ضائع کر دیا"۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے.. میں بالکل بھی کھانا ضائع نہیں کرتا.."

سیف اللہ نے صفائی دی۔

"جی آپ احتیاط سے کھاتے ہیں مگر صرف گھر میں، جب آپ شادی پارٹی میں ہوتے ہیں تو آپ کو لگتا ہے کھانا پھر نہیں ملے گا.. آپ بہت سارا کھانا نکالتے ہیں، پھر وہ پورا نہیں ہوتا اور وہ ضائع ہو جاتا ہے جو کسی اور کی ضرورت بھی پوری کر سکتا تھا.. اللہ کا رزق بہت احترام کے لائق چیز ہے.. ہمیں ہلکا نہ لیا کریں. جیسے پہاڑ پہ آپکا گھر ہے ویسے

پاکستان بھی آپکا گھر ہے اور پاکستانی آپکے گھر والے..ابھی بھی کچھ گھر ایسے ہیں جہاں فاقے ہوتے ہیں. ان کو ڈھونڈ لیا کریں"

سیف اللہ نے ان سے بھی معافی مانگی..آئندہ احتیاط کرنے کا وعدہ کیا اور آگے بڑھ گیا..گھر قریب آگیا تھا..فاصلہ تھوڑا ہی رہ گیا تھا..ہر قدم مشکل تھا..ترقی کا سفر ہوتا ہی مشکل ہے مگر انتھک محنت اور پرچم سے محبت بڑی بڑی چوٹیاں سر کروادیتی ہے..

ایک، دو، تین..بس تین قدم دور..سیف اللہ نے ہمت کی..وہ اپنے گھر تک پہنچ گیا..اس کو اس گھر سے بہت پیار تھا..یہ اسنے بہت قربانیوں اور قدم قدم پہ مشکلات اٹھا کر حاصل کیا تھا..بہت جدوجہد کی تھیں..سیف اللہ رو رہا تھا..اس نے بیگ سے جھنڈیاں نکالیں تو اسکو آواز آئی،

"ہمیں نہیں لگنا..ہمیں بیگ میں ہی رہنے دیں!"

یہ جھنڈیوں کی آواز تھی..روتی ہوئی آواز..

"مگر کیوں؟" سیف اللہ حیران تھا..یہاں تو ہر کوئی ہی بول رہا تھا..

"لوگ ہماری عزت نہیں کرتے..چودہ اگست گزر جائے تو ہم پیروں کے نیچے ہوتے ہیں" غم کی وجہ سے بیچاری جھنڈیوں سے کچھ نہ کہا گیا..

"مجھے بھی چھوڑ آؤ..مجھے بھی مت لگاؤ"

یہ جھنڈے کی آواز تھی..ہمارا پاکستانی پرچم..غم انکا بھی بہت بڑا تھا..بلکہ شاید سب سے بڑا..مگر آواز میں ایسا دبدبہ تھا کہ سیف اللہ سے کچھ بولا ہی نہ گیا..

"تم لوگ میری قیمت نہیں جانتے..میرا حق نہیں پہچانتے..صرف چودہ اگست کو، ہاں ہاں صرف چودہ اگست کو ایک جھنڈے تلے جمع ہوتے ہو..اور باقی سال، نیلے، پیلے، کالے، لال، ہرے اور نجانے کن کن مختلف جھنڈوں کی

خاطر دوسروں سے لڑتے ہو، مزاق اڑاتے ہو، اسلام کے نام پر بننے والے ملک کے یہ کیسے مسلمان ہو.. تم نئی نسل کے لوگ اس جھنڈے کی قیمت کیا جانو.. یہ جو نیچے ہجوم کھڑا ہے نا؟"

سیف اللہ نے نیچے دیکھا.. نیچے بچے، بوڑھے، جوان ہر طرح کے لوگوں کا ہجوم تھا..

"یہ وہ تمام لوگ ہیں جو وطن کی خاطر قربان ہوئے.. جو ایک پرچم کی قیمت جانتے تھے.. سمجھتے تھے.. جو نیک مقصد کے لیے ایک ہوئے تھے.. تم کیا جانو اس پرچم کو پانے کی خاطر تمہارے بڑوں پہ کیا کیا بیت گیا.. مگر تم لوگ، اس ایک پرچم کو چھوڑ کے، ہر پرچم کے نیچے کھڑے ہو.. چھوڑ دو سیف اللہ مجھے"

آواز میں اتنا رعب تھا کہ سیف اللہ حیران تھا.. اسنے ایسی آواز کبھی نہیں سنی تھی..

"میں آپ کو مایوس نہیں کرونگا.. میں دنیا کے ہر گوشے میں، تعلیم و ترقی کے ہر میدان میں آپکا نام روشن کرونگا. .میں نیچے کھڑے ہر انسان کی قربانیوں کا صلہ دینے کی پوری کوشش کرونگا.. میں اپنے ہم وطنوں کو سیدھی راہ پر لانے کی پوری کوشش کرونگا.. میرا وعدہ ہے"

پاک سرزمین کے خوبصورت پرچم کے چہرے پر امید کی کرن جاگی.. سیف اللہ نے پہاڑ کی چوٹی پر سبز ہلالی پرچم گاڑا.. جب خواب سے اسکی آنکھ کھلی تو وہ، سیف اللہ تھا جس کے اندر قدرت نے سوتے ہوئے بہت سے عظائم جگا دیئے تھے.. اللہ تعالٰی ہر پاکستانی کو سچا مسلمان اور مخلص محب وطن بنائے اور پاکستان کو تا قیامت اپنے حفظ و امان میں رکھے.. (آمین)

☆☆☆☆

آزادی

ذوالفقار علی بخاری

ایمان کو آج بہت غصہ آ رہا تھا۔

وہ برداشت کرتی چلی آئی تھی مگر اب حد سے باہر ہو رہا تھا کہ آج پھر سے اس کے والدین نے شادی کب کرنی ہے کا سوال پوچھ لیا تھا۔ ایمان نے ایک مرتبہ پھر سے اپنی شادی کو ٹال دیا تھا کہ وہ ابھی کچھ اور کرنا چاہ رہی تھی۔ ابھی تو اس کی پڑھائی سے جان چھوٹی تھی۔ ایمان نے بہت رو دھو کر دندان سازی کے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے بہت روکا تھا کہ کوئی اور معقول شعبہ دیکھ لو مگر اس کو ایک ہی دھن سوار تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا یہ فیصلہ آزادی سے کر لیا تھا کہ کہیں تو وہ اپنی من مرضی سے جی سکے۔

بچپن سے اماں کی باتیں سن سن کر وہ تنگ آ چکی تھی کہ ڈوپٹہ ٹھیک سے سر پر رکھو، یوں کھل کھلا کر گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں نہ کرو، چھت پر زیادہ دیر نہ رہو، وقت پر سو جاؤ، اسکول سے سیدھا گھر آنا۔

اس کے اندر رفتہ رفتہ بغاوت جنم لے رہی تھی اور ایک دن وہ باغی بن چکی تھی کہ زیادہ روک ٹوک کب تک کوئی سہہ سکتا ہے۔

ایمان یوں بھی اپنی کئی سہیلیوں کی شادیوں کو دیکھ چکی تھی کہ وہ آج پریشان حال تھیں۔ وہ کچھ شادی سے ڈر سی گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مرد ذات ہمیشہ سے ہی عورت کو کچا کھا جاتے ہیں۔ عورت کے پاس کچھ بھی تو اپنا نہیں رہتا ہے۔ ایمان نے بچپن میں اپنی کئی خواتین رشتے داروں کو دیکھا تھا جو شادی کے بعد ظالم شوہروں کی بھینٹ چڑھی ہوئی تھیں، ان کو میکے کے لئے بھی پوچھ کر آنا پڑتا تھا۔ ساس کو اس نے ہمیشہ ایک ظالم حکمران کے طور پر دیکھا تھا کئی سہیلیوں کو تو عید کے دن بھی نئے کپڑے پہننے کو نہیں ملتے تھے، کئی کی زندگی کو کنواری نندوں نے عذاب کر دیا تھا تو کہیں کسی دیور کی چغلی نے ان کی زندگی برباد کر دی تھی۔

ایمان کے بابا جان اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اسی لاڈ پیار کی وجہ سے دندان سازی میں اس نے پڑھائی مکمل کر لی تھی۔ ایمان نے اپنی ضد کی وجہ سے سب کی ناراضگی مول لی تھی لیکن وہ خوش تھی کہ ذہنی طور پر سکون میں ہے کہ

اپنی مرضی سے جینے کا موقع مل رہا ہے۔جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ایمان کو شادی سے نفرت ہونے لگی تھی وہ سوچنے لگی تھی کہ وہ اکیلی رہ سکتی ہے اور مرد کے بنا جی سکتی ہے۔اسے مردوں سے ہی گھن آنا شروع ہو گئی تھی۔اس نے نوکری بھی وہاں کر لی تھی جہاں کوئی مرد بلا اجازت دفتر کے اندر نہیں آسکتا تھا۔سب کام وہاں خواتین ہی سرانجام دیتی تھیں۔مردوں کو گندی نگاہوں سے دیکھنے پر وہ سامنے ہی سب کچھ سنا دیتی تھی تاکہ کسی اور عورت کے لئے بچاؤ کا سبب ہو سکے۔جس کی وجہ سے اس کے کردار پر بات کی جانے لگی تھی۔مگر ایمان نے اپنے اندر کی مضبوطی کی وجہ سے ہر جگہ اپنی اہمیت منوائی تھی۔وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سب اس کی سوچ اور زندگی گزارنے کے طریقہ کار کو سمجھنے لگے تھے مگر کوئی کھل کر نہیں بول سکتا تھا کہ پھر ان پر بھی بات آنی تھی۔

ماں باپ کے گزر جانے کے کچھ سال تو اچھے گزر گئے پھر بھائیوں کی شادی کے بعد تو وہ اور تنہائی پسند ہو گئی تھی۔نوکری من پسند تھی مگر اپنی آزادی سے بہت کچھ کرتی تھی کہ اس نے اپنی سہیلیاں بھی وہی رکھی تھیں جو کہ غیر شادی شدہ تھیں۔ان کی محفل کی وجہ سے اس کو یہ احساس تک نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں پر کچھ کمی سی ہے۔مگر جب آخری وقت میں ایمان کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا تو اس کو اپنی اس آزادی سے نفرت ہو گئی تھی کہ کوئی بھی تو اس کی تیمار داری کرنے والا نہیں تھا، نہ کوئی ایسا فرد پاس تھا جو کہ اس کے کفن دفن کا انتظام کرے کہ سب لوگ اس کی اکیلے رہنے کی ضد پر الگ ہو گئے تھے۔

وہ جو سب کو خوشیاں دیتی تھیں وہ ایک خیراتی ادارے کے تعاون سے دفنادی گئی۔

جہاں اسے آزادی سے رہنے پر کوئی اعتراض نہیں سننا پڑتا تھا۔اس کو اس آزادی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی مگر یہ کوئی بھی تو نہیں جانتا تھا وہ بھی نہیں جو عورت مارچ کے ذریعے حقوق نسواں کی آزادی کی تحریک چلاتے تھے۔وہ بھی اس کے درد کو محسوس نہیں کر سکے تھے کہ عورت آزادی حاصل کرتے کرتے اتنی آزاد ہو جاتی ہے کہ بسا اوقات اس کی اپنی ذات کہیں کھو جاتی ہے اور وہ تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے اور اندر سے مر جاتی ہے پھر اسے زمین کے نیچے جاتے زیادہ دیر نہیں لگتی ہے۔

☆☆☆☆

حب الوطنی

فاکہہ قمر، سیالکوٹ۔

"ارے بیٹا! آج کدھر جا رہے ہو؟"

احمد تے ار کھڑا باہر جانے کی تے اری مے ں تھا جب ہی دادی کی سہمی ہوئی آواز نے اس کے قدم روک دے ے۔

"دادی کچھ کام ہے، کام سے جا رہا ہوں۔"

احمد بخوبی جانتا تھا دادی کی پرے شانی کو مگر اس کا جانا بہت ضروری تھا۔

"بے ٹا! آج نہ جاؤ۔ تم جانتے تو ہو ملک کے حالات کس قدر خراب ہے ں۔ اے سے مے ں تمھارا باہر نکلنا کسی خطرے سے کم نہے ں ہے۔"

دادی نے فکر مندی سے کہا۔

"دادی اُپ بس دعا کرے ں، پرے شان نہ ہوں۔"

احمد اپنی جانب سے دادی کو تسلی دے رہا تھا۔

"ارے بہو! بے ٹے کو منع کے وں نہے ں کرتی ہوں؟" دادی احمد کی ماں سے التجا کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"اماں جی جانے دے ں، اس کا جانا بے حد ضروری ہے۔"

*

"آج اگر اس کو روکا تو روز قے امت کے اجواب دوں گی؟ آج ہمارے ملک کو اس کی ضرورت ہے اسے جانے دے ں اماں جی۔"

احمد کی امی نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"رب تمھارا نگہبان ہو، جاؤ بے ٹا۔ اللہ کے سپر د۔" ماں کا حوصلہ ملتے ہی احمد اپنے کام کی جانب روانہ ہو گیا۔

امی نے احمد کی دادی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

احمد کا تعلق مجاہدے ن کی جماعت سے تھا۔ دن بہ دن کشمے رے ں بدلتے ان سنگے ن حالات سے پورا ملک بہت پرے شان تھا۔ باہر نکلنے کا تو تصور تک ہی محال تھا۔

احمد کے جانے کے بعد دادی دل برداشتہ ہو گئی اور احمد کی ماں پر غصہ کرنے لگی۔

"ارے تم کے سی سنگ دل ماں ہو؟ کے اجانتی نہے ں کہ پلوامہ کے بعد اب اپنا بٹ گرام بھی خطرے سے خالی نہے ں رہا۔ آخر تمھارا دل کے سے مطمئن ہو جاتا ہے؟ شوہر کے بعد دو جوان بے ٹوں کو کھو کر بھی تمھے ں عقل نہ آئی۔"

احمد کی دادی کے منہ سے ں جو آے اغصے سے ں بولتی چلی گئی۔

"اماں جی! مجھے بتائے ں مے ں کے ونکر اسے روکوں؟ آج ہمارے ملک کو اپنے جوانوں کی ضرورت ہے۔ ان سنگے ن حالات مے ں دشمنوں سے اپنے ملک کو نجات دلائیں۔ ملک کی جان، مال اور عزت کی رکھوالی کرے ں۔ جن ماؤں کے لخت جگر شہے دہوئے ملک کا دفاع کرتے، کے اان کے خون اتنے ارزاں ہے ں؟"

"کے اہم اتنے بے ضمے رہے ں ان کی قربانے وں کو بے مول کر دے ں؟"

"جن جوان لڑکے وں کی عزت و عصمت کی رکھوالی کرنے والے ان کے باپ اور بھائے وں کو شہے د کر دے اگے ا، کے اان کا کوئی پرسان حال نہے ں؟"

"کیا ان کی عزتے ں اپنے ہی ملک مے ں غے ر محفوظ ہے ں؟"

"کے اان کی فرے اد پر کوئی ان کی مدد کرنے والا نہے ں ہے؟"

کتنے ہی گھروں کے چراغ بجھا دے ے گئے ہیں۔ بے لٹ گن سے لوگوں کی آنکھے ں تباہ کر کے ان کو زندہ لاش بنا دے اکے اہے۔ کرفے و کے ذرے عے کتنے ہی ماہ لوگوں کو بھوک سے نڈھال کے اگے ااور ہمہ وقت گھروں کی تلاشی کے بہانے ان کی عزتوں کے جنازے نکالے گئے ہیں۔ فون، انٹرنے ٹ بند کر کے عالمی دنے اسے مکمل توڑا گے ا، جے تے جی ہر طرح سے مفلوج کر کے رکھ دے اگے اہے۔"

"اتنے ظلم کرنے والے فرعونوں کو کوئی تو پوچھنے والا ہو۔ کسی کو تو ملک کی آواز بننا ہے۔ اماں جی! اس مشکل وقت مے ں ہمارا ملک چے خ چے خ کر ہمے ں اپنی مدد کے لے ے بلا رہا ہے۔ ہمے ں اپنی مدد آپ کے تحت لڑنا

ہے۔اپنے لیے،اپنے ملک کے لیے،اپنی آئندہ نسلوں کے لیے۔اے سے مےں اگر کوئی اس جنگ مےں شہےد ہو جائے توےہ باعث اعزاز ہے۔اے ک کے اا گر مےرے دس بےٹے بھی ہوتے تو مےں بخوشی انہیں ملک کی خدمت پر مامور کرتی اور جب وہ شہادت پاتے تو مےں اف تک نہ کہتی بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتی۔"

احمد کی امی نے آج اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تھی۔

احمد کی دادی اپنی بات پر اب شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

اسی اثناءمےں دروازہ بجنے لگا۔دونوں عورتیں فوراََ دروازے کی جانب لپکی کہ خدا جانے اب کون سی عافت ٹوٹ پڑی ہے۔

دروازہ کھلتے ہی سامنے احمد کا دوست ابو بکر کھڑا رو رہا تھا۔

احمد کی امی اور دادی بت بنے ابو بکر کو ٹکر ٹکر دےکھ رہی تھی۔

"آنٹی۔دادی۔۔۔"ابو بکر نے روتے ہوئے بمشکل منہ سے ےہ الفاظ ادا کیے۔

"بےٹا!کےا بات ہے؟سب خےرےت تو ہے۔"

دادی نے ہمت مجتمع کر کے ابو بکر سے استفسار کےا۔

"مبارک ہو!احمد شہےد ہو گےا ہے۔اللہ نے اسے شہادت نصےب کی ہے۔"ابو بکر دادی کے گلے لگ کر رونے لگا۔

دادی اپنی جگہ گنگ جبکہ احمد کی امی ادھر ہی بے اختےار ہو کر سجدے مےں جھک گئی،ان کی زبان پر ےہی الفاظ تھے:

"ےااللہ تےرا شکر ہے،ےااللہ مےرے بچے کی قربانی قبول فرما۔اس نے ملک کی عظمت کی خاطر راہ حق مےں اپنی جان دی ہے اسے قبول فرمانا ےارب"۔

☆☆☆☆

آزادی کا سفر

حمیرا علیم

"چپ کر جا کمبخت! چپ کر جا! کوئی سن لے گا اور ہم سب مارے جائیں گے۔ چپ کر جا!" زاہدہ نے اپنے پانچ سالہ بیٹے کے منہ پہ ہاتھ رکھ کے اسے چپ کرواتے ہوئے کہا۔

زاہدہ اسکی ساس، دو نندیں، ایک بیٹا اور بیٹی اسکا شوہر اور سسر سب اپنی جان بچا کر صرف کچھ کاغذات اور زیورات لیکر امرتسر سے بھاگے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ زاہدہ کے شوہر ماجد کے دوست کرن ویر سنگھ نے اس بلوے کی اطلاع اسے ایک دن پہلے ہی دے دی تھی۔ خبر ملتے ہی ماجد بھاگا بھاگا گھر آیا دروازہ بند کیا اور پھولی سانس کیساتھ زاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ زاہدہ ہنڈیا چولہے پہ چڑھائے پھونکنی سے آگ جلا رہی تھی۔ ماجد کے اس طرح گھسیٹنے پر بوکھلا کر بولی۔

" ارے! ارے! کیا ہو گیا ہے ماجد۔ باولے ہوئے ہو ہنڈیا چولہے پر۔۔۔۔" ماجد نے اسے بات بھی پوری نہیں کرنے دی اور اسکے منہ پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"چپ کر جا زاہدہ! اور غور سے میری بات سن۔" ماجد نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" ہمارے محلے پر بلوا ہونے والا ہے۔ جلدی جلدی کچھ سامان باندھ کر تیار ہو جاؤ۔ بچوں کو اور اماں ابا اور مینا شینا کو بھی بتا دے جتنا جلدی ہم یہاں سے نکل جائیں اچھا ہے۔ میں جا رہا ہوں کسی سواری کا بندوبست کر کے آتا ہوں کوئی پوچھے تو کہنا گاؤں میں چچا کا انتقال ہو گیا ہے وہاں جا رہے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ماجد تیزی سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر تک تو زاہدہ کو سمجھ ہی نہ آئی کہ ماجد نے کیا کہا ہے۔ پھر حواسوں میں آتے ہی وہ بھاگ کر ساس اور سسر کے کمرے میں گئی اور ساس کے پلنگ پہ بیٹھتے ہوئے سرگوشیوں میں ساری بات انکو بتا دی۔

" ابا جی! ماجد نے کہا تھا جلدی نکلنا ہو گا۔ اس لئے آپ لوگ تیار ہو جائیں۔"

وہ واپس اپنے کمرے میں گئی بچوں کے اپنے اور ماجد کے چند جوڑے اپنے زیورات اور کچھ پیسے جو اس نے جمع کئے

تھے ایک پوٹلی میں باندھے اور باہر دوڑی۔اتنے میں اسکی نندیں اور ساس سسر بھی تیار ہو کر باہر نکل آئے۔ مغرب کے بعد ماجد ایک بیل گاڑی لیکر آ گیا۔ سردیوں کے دن تھے لہذا سب اپنے گھروں میں بند تھے۔وہ سب خاموشی سے گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی بان نے بیلوں کو ہانکا اور گاڑی چل دی۔ شکر ہوا کہ کوئی گلی میں نہ تھا ورنہ ہندوؤں کو خبر ہو جاتی تو نکلنا محال ہو جاتا۔

جب چند کلو میٹر کا فاصلہ گزر گیا تو زاہدہ کو اپنا گھر یاد آیا۔ کتنی چاہ سے اس نے ہر ایک کمرے کو سیٹ کیا تھا صحن میں پھولوں کے پودے لگائے تھے۔ ہر روز موتیے کے پھول چن کر وہ گجرے بناتی اور اپنی دونوں کلائیوں میں پہنتی تھی۔اسے موتیے کی خوشبو بہت پسند تھی۔"ہائے کیسے بھرا پرا گھر ایکدم چھوڑ کر نکلنا پڑا۔" بے دھیانی میں اس نے بلند آواز سے کہا۔تو اس کے سسر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"شکر کر بٹیا! وقت پہ خبر ہو گئی ورنہ تو جو کچھ ہونا تھا تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جان ہے تو جہان ہے۔ زندہ رہے تو گھر اور سامان پھر مل جائے گا۔ تم لوگوں کی جانوں اور عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ اللہ بھلا کرے کرن پتر کا۔ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ تو بیان بھی نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھٹنوں میں سر دے دیا اور سسکنے لگے۔زاہدہ کے دونوں بچے سو رہے تھے اچانک اسکے بیٹے نے رونا شروع کر دیا تو ماجد نے سختی سے اسے گھرکا۔

"چپ کرو۔ رستے میں کسی کو خبر ہو گئی تو ذبح کر دئے جائیں گے ہم سب۔" زاہدہ اسے گود میں لیکر چپ کروانے لگی۔ سب خوفزدہ تھے کہ کہیں بلوائیوں کو خبر نہ ہو جائے۔ اتنے میں بیل گاڑی رک گئی۔ماجد نے فورا کپڑا اٹھا کر جھانکا اور ایکدم اسکا رنگ فق ہو گیا۔"کیا ہوا ماجد بیٹا! گاڑی کیوں رک گئی ہے؟" اسکی ماں نے پوچھا۔

"اماں! لگتا ہے ہم سے پہلے کوئی قافلہ گزرا تھا اور بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ راستہ لاشوں سے اٹا پڑا ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں۔ میں اور ابا گاڑی بان کی مدد سے راستہ صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر دونوں باپ بیٹا بیل گاڑی سے نیچے اتر گئے۔ شینا اور مینا نے مارے خوف کے رونا شروع کر دیا تو اماں نے انہیں ساتھ چپکاتے ہوئے کہا"چپ رہو بیٹا۔ خدانخواستہ کسی کے بھنک بھی پڑ گئی تو ہمارا حشر بھی انہی جیسا ہو گا۔" وہ دونوں دوپٹے منہ پر دبا کر سسکنے لگیں۔ کچھ لمحوں بعد دونوں باپ بیٹا واپس آئے تو انکے کپڑے خون آلودہ تھے اور چہرے اترے ہوئے۔ بچے بوڑھے جوان عورتیں ہر طرف کٹے ہوئے جسموں کا ڈھیر تھا۔ عورتوں کی لاشوں

سے پتہ چلتا تھا کہ مارنے سے پہلے ان کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ایک چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ نیزے میں پرو کر مار دیا گیا تھا۔مردوں کے جسموں پر کلہاڑیوں اور برچھیوں کے وار تھے۔لگتا تھا انہوں نے جم کر مقابلہ کیا تھا مگر تعداد میں تھوڑے ہونے کی وجہ سے مارے گئے۔ گاڑی چلتی جارہی تھی اور 51 کلو میٹر کا فاصلہ جیسے صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔انہوں نے لالٹین بھی بند کر رکھی تھی تا کہ کوئی انہیں دیکھ نہ سکے۔یخ ٹھٹھرتی رات اور اندھیرے نے ماحول کو اور بھی ہولناک بنا دیا تھا۔گاڑی بان بھی مسلمان تھا جس کے تمام رشتے دار ریل گاڑی کے ذریعے پاکستان جارہے تھے وہ پیچھے رہ گیا تا کہ سب سامان وغیرہ سمیٹ کر گاڑی لیکر پاکستان جائے۔لیکن یہی بات اسکی جان بچا گئی۔ریل گاڑی کو روک کر اس میں موجود تمام مسافروں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔لاہور سے اسکے ماموں زاد نے بتایا تھا۔"جب ہم پھوپھو اور سب گھر والوں کو لینے پہنچے۔اور گاڑی میں جھانک کر دیکھا تو ساری ٹرین لہولہان تھی۔تقریبا سبھی مسافر مر چکے تھے۔چند ایک جو زخمی تھے انہوں نے بتایا کہ بلوائیوں نے ایک اسٹیشن پر گاڑی میں گھس کر سب کو مار دیا۔"

اس دنکے بعد سے اس نے ماجد کے خاندان جیسے کئی خاندان چھپ چھپا کے پاکستان پہنچائے تھے۔اسکے گھر والے تو مارے گئے کوئی اور تو بحفاظت اپنے وطن تک پہنچ سکے۔

سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ماجد سوچ رہا تھا۔کل تک جو ہندو اور سکھ میرے بچپن کے یار تھے آج انہیں کیا ہوا کہ میری زندگی کے دشمن بن گئے؟ عید ہو یا ہولی ہم نے اکٹھے منائی۔دکھ سکھ میں ایک دوسرے کو سہارا دیا پھر اب کونسی آگ بھڑک اٹھی ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے؟ انہی سوچوں میں گم سب دم سادھے بیٹھے تھے۔ اچانک گاڑی بان کی آواز آئی۔"ماجد بھائی! اللہ کا شکر ہے ہم بارڈر پر پہنچ گئے ہیں اب ہم محفوظ ہیں"۔سب نے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر فوج کی چوکیوں سے روشنی نظر آرہی تھی۔گاڑی بان انہیں ایک محفوظ راستے سے پاکستان تک لے ہی آیا تھا۔سب نے خوشی سے رونا شروع کر دیا۔جلد ہی ہم اپنے وطن میں سکون سے رہ سکیں گے۔

☆☆☆☆

دنیائے ادب کا اُبھرتا ہوا روشن ستارہ: صبا اظہر

تحریر و ملاقات: فاکہہ قمر

برقی پتہ: xmano54321@gmail.com

کامیاب ہونا ہر انسان کا بنیادی حق اور خواب ہے لیکن اس کے حصول کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں بہت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ محنت تو ہر کوئی کرتا ہے لیکن بعض لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ وہ مختصر مدت میں کامیابی کے راہ کے مسافر بن جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک باصلاحیت لکھاری کا آج خصوصی انٹرویو پیش کیا جارہا ہے جنہوں نے بہت کم وقت میں اپنے کام کی بدولت اپنا نام بنالیا ہے۔

صبا اظہر نے اپنے وسیع تر مطالعے کی بنیاد پر خود پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی مدد آپ کے تحت 2020ء میں ویب سائٹ سے لکھنے کا آغاز کیا اور پھر یہ سفر 2022ء میں رسائل اور ڈائجسٹ تک جا پہنچا اور اب یہ باقاعدگی سے ہر ماہ کئی معیاری رسائل اور ڈائجسٹ میں شائع ہو رہی ہیں۔ بیک وقت کئی اصناف پر طبع آزمائی کرنے والی قلم کار کو آج انٹرویو کے ذریعے جانتے ہیں کہ انہوں نے کیسے قاری سے لکھاری تک کا سفر طے کیا اور یہ سفر کیسا رہا۔

ذیل میں ان سے ہوئی ملاقات کا احوال پیش کیا جارہا ہے:

اسلام علیکم صبا! کیسی ہیں آپ؟

وعلیکم السلام! میں خیریت سے ہوں۔

بہت شکریہ اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکالنے کے لیے، مجھے یہ بتائیں کہ:

س: اپنی ذاتی زندگی اور مصروفیات کے متعلق کچھ بتائیں۔

ج: میرا نام صبا اظہر ہے ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں سنگل ہوں اور بی اے کیا ہوا ہے۔ راولپنڈی میں رہتی ہوں، تعلیم بھی راولپنڈی سے ہی حاصل کی ہے۔ ان دنوں ادبی دنیا میں قدم مضبوط کرنے میں ہی مصروف ہوں۔

س: آپ کا بچپن کیسا گزرا ہے؟

ج: میرا بچپن کافی اچھا اور شاندار گزرا ہے، کھیل کود اور شرارتوں میں ہی گزرا ہے۔ میرے خیال سے اگر انسان کا بچپن اچھا گزرے تو اس کا آنے والا حال اور مستقبل بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔

س: آپ کی تعلیم کتنی ہے؟

ج: میں نے بی اے کیا ہے اب ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔

س: زمانہ طالب علمی میں آپ کیسی طالبہ تھیں؟

ج: زمانہ طالب علمی میں اچھی طالب علم رہی ہوں۔ الحمدللہ کبھی بورڈ کے امتحانات میں فیل نہیں ہوئی۔ بورڈ کے امتحانات میں فیل ہونے سے میں بہت ڈرتی تھی اس لیے کوشش یہی ہوتی تھی اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔

س: لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: لکھنے کا خیال مجھے 2020 میں آیا تھا یہ بات جان کر آپ کو تھوڑی حیرت ہو سکتی ہے کہ لکھنے کا خیال مجھے پامسٹری سے آیا تھا۔ ایک دن میں سوشل میڈیا پر ہتھیلی کے مطالعے کی ویڈیو دیکھ رہی تھی وہیں پر بتایا جا رہا تھا یہ لائن جن لوگوں کے ہاتھ میں موجود ہوتی ہے ان میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ وہ لائن میرے ہاتھ کی ہتھیلی میں بھی موجود تھی بس میں نے جوش میں آ کر قلم اور رجسٹر اٹھا لیا اور الحمدللہ ایک لکھاری بن گئی۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہوتا ہے پامسٹری کچھ نہیں ہوتا جن لوگوں کے ہاتھ نہیں ہوتے ان کی بھی قسمت ہوتی ہے ہاتھ کی لکیریں کچھ نہیں ہوتی لیکن میرا یقین ہے اللہ کی بنائی چیزیں بے مقصد نہیں ہوتیں ہر شے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جو آپ کو کبھی نہ کبھی فائدہ ضرور دیتی ہے۔ ویسے بچپن میں جب میں کوئی نو یا دس سال کی بچی تھی تب بچوں کے موضوع پر کچھ کہانیاں لکھی تھیں، پھر انہیں لکھ کر پھاڑ دیا تھا۔

س: پہلی دفعہ لکھنے کے لیے تحریک کا موجب کیا بنا تھا؟

ج: پہلی دفعہ نئے افق ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہی تھی سوچا ایک افسانہ بھیج کر اپنی قلم آزمائی کی جائے۔ کہانی بھیجنے کے ایک ماہ بعد ہی کہانی شائع ہو گئی۔ بس میری تحریک کا موجب نئے افق کا مطالعہ بنا۔

س: کیا قلم کو تھامتے وقت آپ اس کی حرمت اور پاسداری سے واقف تھیں؟

ج: نہیں، میں اس وقت قلم کی حرمت اور پاسداری سے واقف نہیں تھی۔ مجھے لکھنے کا شوق تھا اسی شوق کو پورا کرنے کے لئے میں نے قلم اٹھالیا تھا مگر اب جیسے جیسے ادب کی دنیا میں قدم مضبوط ہو رہے ہیں قلم کی حرمت اور پاسداری سے واقف ہو رہی ہوں۔ قلم اٹھنا ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ قلم کا صحیح استعمال کرنا لکھاری کا فرض ہوتا ہے جب ایک لکھاری کچھ لکھتا ہے تو پڑھنے والے کے ذہن میں ہزاروں سوچیں پیدا ہوتی ہیں اس لیے قلم اٹھانے والے کا فرض ہے وہ اپنے قلم کا استعمال مثبت کرے۔

س: کوئی ناقابل فراموش واقعہ جو آپ قارئین کو بتانا چاہیں۔

ج: انسان کی زندگی میں اکثر ایسے ناقابل فراموش واقعات ہوتے ہیں جو وہ کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ایک واقعہ میں بھی نہیں بھول سکی اچھا اور یادگار واقعہ ہے۔ سکول کے دنوں کی بات ہے جب میں مڈل کلاس میں تھی میری ایک ہی بیسٹ فرینڈ مائیا ہوا کرتی تھی وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی دوست بچھڑ جاتے ہیں مگر ہمیشہ یاد رہتے ہیں ہم بھی بچھڑ جائیں گے مگر ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔ سکول ختم ہوا تو کچھ ماہ بعد رابطہ بھی ختم ہو گیا مگر اس کی کہی یہ بات آج بھی مجھے اسکی یاد دلاتی ہے اور میں اپنی دوست کو بہت یاد کرتی ہوں۔ یقیناوہ بھی مجھے یاد کرتی ہو گی۔ اللہ نے چاہا تو ہم کسی دن ضرور ملیں گے۔

س: کیا آپ کی کبھی کسی نے حوصلہ افزائی کی ہے؟

ج: میری فیملی نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میری امی، ابو، بھائی اور بہن سب نے میری صلاحیت کو سراہا ہے۔

س: ادب کی کون سی صنف میں لکھنا پسند کرتی ہیں؟

ج: ادب کی دنیا میں میرا پہلا آغاز معاشرتی کہانی سے ہوا تھا۔ معاشرتی، ہارر، رومانی، بچوں کے حوالے سے سب پر لکھ چکی ہوں لیکن سب سے زیادہ مجھے جس صنف پر لکھنا اچھا لگتا ہے وہ لمبے اور قسط وار رومانی اور سسپنس ناول ہیں۔

س: ویب سائٹ سے ادبی جریدے، اخبارات اور ڈائجسٹ تک رسائی کیسے ممکن ہوئی ہے؟

ج: اخبارات اور ڈائجسٹ سے میرا تعلق بچپن سے ہی ہے۔ اخبارات اور ڈائجسٹ تقریباہر گھر کی ہی زینت بنتے ہیں۔ ہمارے گھر کی بھی زینت بنتے تھے اس لئے انہیں پڑھتی رہتی تھی۔ خاص کر بچوں کی کہانیاں بہت شوق سے

پڑھا کرتی تھی اور ویب سائٹ سے میرا تعلق 2019 میں اپنی ایک دوست کے ذریعے بنا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے ناول تلاش کروا کر پڑھا کرتی تھی یوں میرا رجحان ویب سائٹ کی طرف بھی آیا۔

س: مختصر مدت میں افسانہ نگاری اور بچوں کی لکھاری تک کا سفر کیسے طے کر لیا ہے؟

ج: مجھے ڈائجسٹ میں لکھتے ہوئے سات ماہ گزرے ہیں۔ الحمدللہ بہت کم مدت میں کافی ڈائجسٹ میں لکھ چکی ہوں سات ماہ میں تقریباً پندرہ سے زائد کہانیاں شائع ہو چکی ہیں اتنا لمبا سفر کم وقت میں کیسے طے کر لیا کبھی کبھی مجھے حیران کن لگتا ہے بس کچھ اچھا کرنے کی لگن میں لکھاری کا سفر طے کر رہی ہوں۔

س: بطور ادیبہ کس صنف میں اپنی پہچان بنانا پسند کرتی ہیں؟

ج: رومانی اور سسپنس صنف میں اپنی پہچان بنانا پسند کرتی ہوں۔

س: مستقبل قریب میں مزید کن اصناف اور موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: مستقبل میں میرا ارادہ زیادہ بچوں کے موضوعات پر لکھنے کا ہے۔ میں بچوں کے ادب میں ایک مقام بنانا چاہتی ہوں اور اس کے ساتھ سسپنس سٹوری لکھنے کا ارادہ کر رہی ہوں لیکن ابھی اس موضوع پر ابھی تک قلم نہیں اٹھایا۔

س: اب تک کے ادبی کیریئر میں ادبی دنیا کو کیسا پایا ہے؟

ج: الحمدللہ! ادبی دنیا میں بہت کچھ اچھا اور منفرد سیکھنے کو ملا ہے ادبی کیریئر کا آغاز میری زندگی کا سب سے خوبصورت تحفہ ہے۔ ادبی دنیا وہ دنیا ہے جہاں انسان اچھائی اور برائی کا فرق پہچان سکتا ہے اپنی زندگی علم کے ذریعے سنوار سکتا ہے۔

س: کیا خواتین کے لیے یہ پروفیشن موزوں ہے؟

ج: جی بالکل۔ ادب کا پروفیشن خواتین کے لئے موزوں ہے۔ ایک لڑکی کے لئے اسلامی و دنیاوی تعلیم بہت ضروری ہوتی ہے۔ عورت میں اگر شعور ہو گا تبھی اس کی گود میں پرورش پانے والے بچے کو شعور حاصل ہو گا۔ میرے خیال سے پاکستان کی ہر لڑکی کو اس پروفیشن کو اپنا کر اپنی زندگی کو خوبصورت بنانا چاہیے۔

س: آپ کی نظر میں ایک مخلص اور سچے ادیب کی کیا پہچان ہے۔ اس میں کن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے؟

ج: میری نظر میں ایک مخلص اور سچے ادیب کی یہی پہچان ہے کہ وہ اپنے لکھے ہوئے پر پہلے بذات خود عمل کرے۔ جو ادیب محض شہرت حاصل کرنے کی خاطر لکھتا ہے میرے خیال میں پھر اس کے لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بچوں کا ادب ایک حساس ادب ہے اس میں سب سے پہلے خود سے مخلص ہونا ضروری ہے۔ رہی خصوصیات کی بات تو میری نظر میں ادیب کو حساس ہونا چاہیے۔ اس میں ہر وہ اچھی خصوصیت ہونی چاہیے جو وہ بچوں میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ خود تو جھوٹ بولتا ہو لیکن بچوں کو یہ درس دے کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔

س: کیا آپ خود سے لکھتی ہیں یا کسی ادبی استاد سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں؟

ج: میں نے جب لکھنا شروع کیا تھا خود ہی لکھتی تھی رہنمائی کے لیے کوئی استاد نہیں تھا مگر اپنی بڑی بہن سے ایک بار کہانی کا مطالعہ کروالیا کرتی تھی لیکن اب ایک ادبی استاد کی رہنمائی مجھے حاصل ہے جو اکثر مجھے لکھنے کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ ہر کامیاب سے کامیاب شخص کو بھی ہمیشہ ایک استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

س: ادب عالیہ اور ادب اطفال کے کن دور حاضر ادیبوں کو پڑھ کر کچھ سیکھنے کو ملتا ہے؟

ج: دور حاضر میں ماشاءاللہ کافی ایسے ادیب ہیں جن کے قلم میں جادو ہے وہ جب کچھ لکھتے ہیں تو کمال کر دیتے ہیں۔ سرگزشت ڈائجسٹ میں محترم عاطر شاہین کا قسط وار ناول "روسیاہ" بہت دلچسپ ہے میں باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اگر بچوں کے ادیبوں کی بات کروں تو اس وقت تقریباً سب ہی بے مثال لکھ رہے ہیں ان میں چند نمایاں نام فاکہہ قمر، ذوالفقار علی بخاری اور بہت سے لکھاری ایسے ہیں جو تعریف کے قابل ہیں۔

س: کیا کبھی آپ کی کسی تحریر کو ناقابل اشاعت ٹھہرایا گیا ہے؟

ج: جی، ایک دو بار ایسا ہوا ہے جب تحریر ڈائجسٹ والوں کو اپنے معیار کے مطابق نہیں لگی اور وہ ناقابل اشاعت ٹھہرائی گئی لیکن میں نے ہمت اور حوصلہ نہیں ہارا بلکہ میں کوشش کر رہی ہوں کہ پہلے سے بہت اچھا لکھوں تاکہ جس ڈائجسٹ نے میری کہانی ناقابل اشاعت ٹھہرائی ہے ان کو میری نئی تحریر اپنی جانب راغب کرنے پر مجبور کر دے۔

س: کیا ادب کے میدان میں بھی خواتین اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و ملت کی ترقی و خوشحالی کی ضامن ثابت ہو سکتی ہیں؟

ج: ادب میں خواتین کے کردار سے انکار ممکن نہیں ہے۔ میرا ماننا ہے مرد اور خواتین دونوں میں قدرتی طور پر صلاحیت موجود ہوتی ہے ہر دور میں خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو ادب کی ترقی میں عورتیں پیچھے رہ جائیں۔ ادب کی دنیا میں خواتین نے ہمیشہ خواتین اور قوم کا نام روشن کیا ہے اور انشاءاللہ آگے آنے والے وقت میں بھی ملک کی ترقی و خوشحالی کا ضامن ثابت ہوں گی۔

س: موجودہ دور میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے کیا وہ معاشرے کی ضروریات کے عین مطابق ہے؟

ج: موجود دور میں اچھا اور برا دونوں پڑھنے کو مل رہا ہے اکثر رائٹرز معاشرے کے حالات کو مد نظر رکھ کر اپنا قلم اٹھا رہے ہیں معاشرے کی ضروریات وقت کے ساتھ بدل رہی ہیں اس لیے ادب کی تخلیق ضروریات کے عین مطابق ہے۔

س: ایک لکھاری کے لیے تنقید اور تعریف کس قدر معنی رکھتی ہے؟

ج: تنقید اور تعریف دو ایسے لفظ ہیں جو انسان کی زندگی پر کافی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں ایک لکھاری جب کچھ لکھنے کا آغاز کرتا ہے تب اگر اسے لوگوں کی طرف سے اچھے الفاظ کے ذریعے تعریف سننے کو ملے تو اسکی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اگر تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو شوق کے ساتھ جذبات بھی مدھم ہو جاتے ہیں۔ مثبت الفاظ لکھاری کی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں جبکہ منفی الفاظ لکھاری کی شخصیت کا توازن بگاڑ دیتے ہیں۔

س: آپ اپنی زندگی کو کس زاویے سے دیکھتی ہیں۔ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

ج: انسان کائنات کا تاج ہے۔ میرے نزدیک دنیا کی زندگی سوائے کھیل تماشا کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور آزمائش کے طور پر اس دنیا میں بھیج دیا ہے۔ ہم اس دنیا میں آ تو گئے ہیں مگر جینے کا سلیقہ ہم میں سے شاید کچھ ہی لوگ جانتے ہیں۔

س: کن ادیبوں کے کام کو اپنے لیے مشعل راہ تصور کرتی ہیں؟

ج: پاکستان کے ہر ادیب ہی کمال کے ہیں مگر بانو قدسیہ کا میری نظر میں ایک اعلیٰ مقام ہے۔ افسانے، ناول، شاعری ان کا ہر لفظ دل پر اثر کرتا ہے اور اگر شاعر کے حوالے سے بات کروں تو موجودہ دور میں تہذیب حافی میرے نزدیک بہترین شاعر ہیں۔

س: آپ کے نزدیک کن موضوعات پر کام کرنا ضروری ہے؟

ج: میرے نزدیک بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن پر کام کرنا بے حد ضروری ہے۔ پہلا بچوں کے موضوعات پر کام کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ بچوں کا رجحان کتابوں اور علم کی طرف سے ہٹ کر موبائل فون کی طرف بڑھ رہا ہے۔ موبائل فون کی دنیا میں مگن ہو کر وہ نہ صرف اپنا آپ تقریباً کھو چکے ہیں بلکہ کتابوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ آج دیکھا جائے تو ہر بچے کے ہاتھ میں موبائل ہے۔ بچے والدین سے فرمائش کر کے مہنگے موبائل خرید لیتے ہیں لیکن کتاب خریدنے کا نہیں کہتے ہیں۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو موبائل سے ہٹا کر کتاب کی طرف راغب کریں۔ دوسرا اہم موضوع خواتین پر ہونا چاہئے ایک لڑکی چاہے کتنی بھی بہادر اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے وہ آج بھی ہر اساں ہونے سے ڈرتی ہے، اکیلے بازار جانے سے پہلے کئی بار سوچتی ہے، سورج ڈھلنے کے بعد گھر کی دہلیز پار کرنے سے خوف کھاتی ہے۔ میرے نزدیک ان دو موضوعات پر کام کرنا بے حد ضروری ہے۔

س: قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گی۔

ج: آپ سب کا بہت شکریہ جنہوں نے میرا انٹرویو پڑھا خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں، اپنے مفاد کے لیے دوسروں کا استعمال نہ کریں۔ کوشش کریں آپ کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ آپ کا دیا ایک دھوکہ دوسرے انسان کو ساری دنیا کے لوگوں سے بے اعتبار کر سکتا ہے۔ اللہ حافظ!

اس کے ساتھ ہی انٹرویو اپنے اختتام کو پہنچا۔

☆☆☆☆

آخری جنگ

ہویدا اصالح

عدالت سے باہر آکر چادر سنبھالتی وہ تیز تیز چلنے لگی۔ نظریں جھکی ہوئیں۔۔۔ مگر سر اور گردن بلند۔
پیچھے چند افراد کیمرہ لئے اس کے پیچھے آنے لگے۔

"جی، عائشہ صاحبہ، ابھی تک آپ کے کیس میں کیا پیش رفت ہوئی ہے؟"

"کیا آپ کو لگتا ہے، آپ کی اس کوشش سے جلال احمد کو سزا ہو جائے گی؟"

"کیا عدالت آپ کے ساتھ تعاون کر رہی ہے؟"

طرح طرح کے سوالوں کے جواب دیئے بنا آگے بڑھی اور عدالت کے احاطے سے باہر نکل گئی۔

****

عائشہ کاغذات پھیلائے ان میں سر دیے بیٹھی تھی۔ نئے ثبوت ملے تھے اسے جلال احمد کے خلاف۔ اس نے وکیل کو فون کر کے بتایا اور دونوں نے مزید بات ملاقات میں کرنے کا فیصلہ کیا۔

فون رکھ کر وہ

گاو

ؤ تکیہ سے سر ٹکا کر لیٹ گئی۔

بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے چہرے پہ گیا۔ چھلی ہوئی چمڑی گالوں اور گردن پہ محسوس ہوئی۔ اس جلن کی یاد۔۔۔ وہ یاد تازہ ہو گئی۔ آہ!۔۔۔ اس کے منہ پر تیزاب، اس کی چیخیں، مجرموں کے قہقہے۔۔۔ ہتک اور انتقام کے جذبات زور پکڑ گئے۔

وہ جلال کو ایسے نہیں جانے دے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

**

پانچ ماہ پہلے۔۔۔

عائشہ یونیورسٹی کی بس سے اتر کر گلی میں گھر کی جانب پیادہ پا رواں تھی۔ عقب سے کسی کے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے گریز کیا۔ کڑی دھوپ میں اسے پشت سے ایک مردانہ سایہ نظر آیا۔

سایہ قریب آتا گیا۔

یااللہ۔۔۔

قدموں کی رفتار بڑھا گئی وہ۔۔۔ سایہ بھی تیز ہو گیا۔

قریباً دوڑتی ہوئی عائشہ گھر میں داخل ہو گئی۔

پیچھے سایہ رہ گیا تر چھی مسکراہٹ لیے، جیسے جو کام کرنا تھا وہ تو کر لیا۔

**

موسمِ سرما کی آمد آمد تھی۔۔۔ شام کے گہرے سائے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے مگر ابھی مکمل اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ عائشہ کو آج یونیورسٹی سے گھر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

اندھیرا چھا رہا تھا اسے احساس تھا امی ابا پریشان ہوں گے۔

"عائشہ"

اس کے قدم جامد ہو گئے۔

یہ کون۔۔۔؟

مڑ کر دیکھا۔۔۔ ناشناسا چہرہ۔۔۔

گھبرائی اور مڑ کر جانے ہی والی تھی کہ سرخ آنکھوں والا، بڑھے بالوں والا وہ مرد بول اٹھا۔

"سنو تو۔۔۔ اتنا ڈرتی کیوں ہو۔۔۔ بات کرنی ہے"

اور کچھ سننے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔

بہت دیر تک بھاگتی، وہ پھولی سانس لئے گھر میں داخل ہوئی اور پریشان چہرہ لئے دروازہ سے ٹک کر کھڑی ہو گئی۔

یہ کون ہے جو بنا جانے پیچھے پڑا ہے۔

"عائشہ کیا ہوا؟"، اتنی دیر ہو گئی۔۔۔ رو کیوں رہی ہو؟ سب خیریت ہے نا؟"

"نہیں اماں، وہ رستے میں گر گئی تھی۔ تو پاو

ں پر چوٹ لگ گئی۔" اس نے انہیں پریشاں کرنا مناسب نہ سمجھا۔

خود کو سنبھالتی وہ اٹھی۔ اور اگلا دن خیریت سے گزرنے کی دعا مانگتی رہی۔

کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔۔۔ وہ شخص جو بھی تھا ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ چکا تھا۔ اسے اپنا آپ زندگی میں کبھی بھی اتنا بے بس نہیں لگا تھا۔

عائشہ کرتی بھی تو کیا۔۔۔؟

اس نے بہتیرے نظر انداز کیا۔ ایک دو بار جھڑک بھی دیا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

بقول اس کے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ۔۔۔ اس کے منہ پہ انکار کر چکی تھی۔

آج وہ تہیہ کر چکی تھی اس نے تھوڑی سی پیش رفت کرنے کی کشش کی تو وہ سخت قسم کا جواب دے دے گی۔

دور کہیں تقدیر بھی ان ارادوں پہ خندہ زن تھی۔

واپسی پہ وہ انسان پھر پیچھا کرتا نظر آیا۔۔۔ پہلے اس نے نظر انداز کیا۔ اور پھر۔۔۔

وہ مڑی۔۔۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔۔۔ جلتا سیال اس کے منہ پہ۔۔ وہ تڑپ اٹھی۔ آہ۔۔۔ وہ چہرے پہ ہاتھ رکھ کے چیخی۔۔۔ زمیں پہ گر گئی۔

اس کی چیخوں سے پرندے پھڑ پھڑا اٹھے۔ فلک شگاف آہیں۔۔۔ اور اس کے چہرے پہ تیزاب۔۔

وہ شخص چلتا بنا۔۔۔ جیسے کسی بات کا خوف نہ ہو۔۔۔

**

اس کی آنکھ ہسپتال میں کھلی۔ چہرے اور گردن پہ جلن محسوس ہوئی۔ پٹیوں میں جکڑا چہرہ۔۔۔ اس کو ایک آنکھ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔

اس نے ہاتھ لگانا چاہا۔۔۔ آنکھ بند تھی، کیا اس کی آنکھ ضائع ہو گئی ہے؟

"نہیں!"

یہ نہیں ہو سکتا۔

وہ رو دینے کو تھی۔

چھت کو گھورنے لگی، قسمت سے شکوہ کناں۔۔۔ اس کا قصور کیا تھا۔۔۔

وہ اپنے آپ سے اور جھلسے ہوئے چہرے سے سوال کرنے لگی۔

آج کئی دن بعد اس کی پٹیاں اتری۔۔۔ اس نے خود کو جھجھکتے ہوئے آئینے میں دیکھا۔۔۔ تو ڈر گئی۔۔

یہ تو عائشہ نہیں تھی۔

گو وہ پہلے بھی کوئی بہت حسین نہ تھی۔۔۔ مگر اس کریہہ چہرے سے نا آشنا تھی۔ اس نے آئینہ زمیں پہ پٹخ دیا۔

ٹکڑے کھنک اٹھے۔۔۔ شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔۔۔

اور سر جھکا کر آنسو پینے لگی۔

ٹوٹے ہوئے آئینے میں اب بھی اس کا نامکمل عکس نظر آ رہا تھا جس سے اس نے نظریں چرا لی تھی۔

اپنے نامکمل عکس اور نامکمل خواب لئے وہ کچھ دیر سوچتی رہ گئی۔

*

جلال۔۔۔ جلال احمد نام تھا اس کا۔۔۔ ایک جاگیر دار کا بیٹا تھا۔

یقیناً نہ سننے کی عادت نہیں تھی اسے۔۔۔ تبھی۔۔۔ عائشہ نے سوچا۔۔۔

تبھی تو اس کے نہ کی اتنی بڑی سزا ملی۔

مگر سزا تو اب وہ بھی جھیلے گا۔۔۔ اسے بھی تکلیف ہو گی۔۔۔

عائشہ کے ہاتھ کی مٹھی بن گئی۔۔۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں اتنی زور سے پکڑا وہ اس کے ہاتھ میں چکنا چور ہو گیا۔۔۔

اور اس کا ہاتھ لہولہان ہو گیا۔

میز پہ ہاتھ مارتی وہ اٹھی۔

لہو بہتا ہاتھ، اور سرخ آنکھیں لیے وہ خلاو

ں میں گھورتی پلان بنانے لگی۔

*

جلال احمد کے ماضی کے ثبوت جمع ہو چکے تھے۔ وہ کئی لڑکیوں کو اپنی انا کا نشانہ بنا چکا تھا۔
اس کا فیصلہ کئی لوگوں کو بیوقوفی لگی تھی۔ کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے مگر لڑے بغیر تو وہ نہیں چھوڑے گی۔
ع: جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔
پرسوں کیس کی پہلی سماعت تھی۔ وہ پر امید تھی۔ اتنے عرصے میں کم از کم طنز، طعنوں کے تیر سہہ سہہ کر تو اس میں بلا کی برداشت آگئی تھی۔ ٹی وی پہ اپنے متعلق خبریں دیکھ کر وہ سمجھ نہ پائی کہ لوگ اس سے ہمدردی کر رہے ہیں؟ ساتھ دے رہے ہیں یا اس کا مزاق اڑا رہے ہیں؟ مگر پھر بھی وہ کر لے گی۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ وہ کر لے گی۔
کیس کی پہلی سماعت پہ ملزم حاضر ہی نہ ہوا۔ نہ پولیس اسے پکڑنے میں کامیاب ہو سکی۔ یقیناً وہ فرار ہو چکا تھا۔
اس کے وکیل نے عدالت میں اپنے تئیں ثبوت پیش کئے۔۔۔ زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی۔
سماعت دو ہفتوں تک ملتوی کر دی گئی۔

**

دوسری پیشی۔
ملزم جلال احمد۔۔۔ حاضر تھا۔۔۔ اپنے باپ کو آتا دیکھ کر اس کے چہرے پہ ایک تمکنت تھی۔ جیسے وہ جانتا تھا کہ کوئی اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔
عائشہ وکیل کے ساتھ ابھی پہنچی نہ تھی۔
وہ آنے ہی لگی تھی کہ عدالتی احاطے میں جاگیر دار جواد احمد کی آواز گونجی۔

"کر دو"

دھڑا دھڑ گولیاں چلنے لگی۔ عائشہ کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ وہ لہولہان زمین دراز ہو گئی۔ اس کے وکیل کو بھی کئی گولیاں لگی تھی۔ دونوں موقع پہ جاں بحق ہو چکے تھے۔ اور اس کے بابا۔۔۔ وہ گھٹنوں کے بل پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹی کا جھلسا چہرہ اور لہولہان لاش دیکھنے لگے۔

"اونہہ، ہم سے لڑنے چلی تھی"

جواد احمد نے ہنکارا بھرا۔

عائشہ۔۔۔ اس ظلم کے خلاف اپنی آخری جنگ لڑتے ہوئے، زندگی کو جواب دے چکی تھی۔

مگر نا جانے اور کتنی مزید عائشہ کی آواز دبادی گئی تھی۔

******

"پاکستان زندہ باد"

کفایت اللہ

عرفان ایک نیک اور لائق بچہ تھا۔ اس کے والد ایک فیکٹری میں مینجر تھے۔ عرفان کے دل میں محبت اور ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ وہ کسی غریب یا ضرورت مند کی مدد کر سکے۔

14 اگست کا دن قریب تھا۔ عرفان کے تمام دوست اپنے گھروں کو جھنڈیوں سے سجا رہے تھے۔ عرفان کو بھی جھنڈیاں خریدنے کے لئے پیسے ملتے تھے لیکن چودہ اگست کے دن اس کے دوست اس کے گھر آئے تو انہوں نے اس کے گھر کو کوئی خاص سجا ہوا نہ دیکھا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا گھر والوں نے تمہیں پیسے نہیں دیئے تھے تو اس نے بتایا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے گھر والوں نے پیسے دیئے تھے۔ لیکن میں نے انہیں کسی اور جگہ خرچ کر دیا۔

ایک دوست نے پوچھا کون سی جگہ تو؟

عرفان بولا، چاچا بشیر کو تو تم جانتے ہو۔ بے چارا بڑا غریب ہے۔ ایک دن میں اس کے گھر کے سامنے سے گزرا تو کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ چاچا بشیر کا بیٹا تھا میں نے چاچا بشیر سے اس کے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس

کے پاس جوتے نہیں ہیں۔ اس لئے رو رہا ہے۔ میں غریب کہاں سے اتنے پیسے لاؤں کہ اسے نئے جوتے خرید کر لا دوں۔ میں محنت مزوری سے جو کچھ کماتا ہوں، اس سے بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔

"مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا اور میں نے جو پیسے جھنڈیاں خریدنے کے لئے رکھے تھے اس کو دے دیئے۔"۔

عرفان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "دوستو ویسے بھی ان پیسوں سے خریدی گئی جھنڈیاں کچھ دن بعد پھٹ جاتی ہیں لیکن چاچا بشیر جوتوں کے لئے پیسے کہاں سے لاتا"۔

اتنے میں اس کے ابو کمرے میں آئے اور کہا "عرفان بیٹا شاباش! میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم نے ایک غریب بچے کی مدد کی۔ اگر ہمارے ملک کا ہر شہری ایک دوسرے کی مدد کرے تو ہم دنیا کی ایک خوش حال اور طاقت ور قوم بن سکتے ہیں"۔

☆☆☆☆

"تحریک پاکستان کا ایک گمنام سپاہی۔۔نانا جانی"

ملک محمد احسن۔راولپنڈی۔

جان محمد نام تھا وہ صرف جانی بن کر ہی ساری عمر زندہ رہا۔ ہماری نسل کے لیے وہ نانا جانی تھا مگر ہم سب پہلے کی نسل کے لیے وہ ماما جانی تھا۔ وہ جانی جو مشرقی پنجاب کے اے ک گاؤں میں پیدا ہوا تھا، جس کے ماں باپ کا اس کی ذاتی تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں اس کے دادا کا پنڈ اور نانا کا پنڈ کے تذکرے ضرور ہم نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے۔ دادا کا پنڈ اور نانا کا پنڈ کے درمیان شٹل کاک بنا، مختلف گھروں میں بے لوث خدمت گار بنا رہا۔ مختلف لوگوں کی روٹیاں اور جھڑکے اں کھاتا ہوا آخر کار جانی بھی جوان ہو گے ا۔ قے ام پاکستان کے وقت وہ کڑیل جوان تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو نانا جانی بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ زندہ دل شخصیت کے حامل نانا جانی کی آنکھوں کی اداسی مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ہر گھر میں بلا تکلف آنا جانا اس کا غیر تحریری حق سمجھا جاتا تھا۔ کسی بھی گھر کے معاملات میں دخل اندازی کا حق بھی اسے حاصل تھا۔ کوئی بھی اسے اپنا کوئی بھی کام سونپ سکتا تھا۔ کسی کو انکار کرنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔

کسی گھر میں خاتون خانہ کے ساتھ سبزی بناتا تو کسی خاتون کے بچے کو کھلا رہا ہوتا۔ کسی کے بیمار بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا بھی اس نے اپنے فرائض میں شامل کر رکھا تھا۔ خاص طور پر شادی بیاہ ے اغمی خوشی میں اس کی مصروفیت اور بڑھ جاتی۔ آنے جانے والے مہمانوں کی مہمان داری، صاحب خانہ کی ذمہ داری نہ رہتی بلکہ نانا جانی وہ معاملات خود ہی سنبھال لیتا۔ حقہ پانی سے لے کر کھانا کھلانے تک نانا جانی ہی کی ذمہ داری تھی۔ نانا جانی نے ساری عمر تجرو کی حالت میں گزار دی تھی۔ شادی نہ کرنے کے باوجود وہ سینکڑوں نہیں بلکہ بلا مبالغہ ہزاروں لوگوں کا نانا تھا۔ ہے نا حیرت کی بات؟

قے ام پاکستان سے پہلے آوارہ پھرنے والا جانی قے ام پاکستان کے بعد اے ک ہیرو بن کر ابھرا۔ اس کی جواں مردی پر اے ک زمانہ اش اش کر اٹھتا تھا۔ 1947ء کے انقلاب کے وقت مشرقی پنجاب سے نقل مکانی کر کے آنے والے لوگوں نے جہاں بہت سے مصائب جھیلے وہاں سب سے زے ادہ تکلیف دہ امر ان بچیوں کا بچھرنا تھا جنہیں سکھوں اور ہندوؤں نے اے ک سازش کے تحت اغواء کے اتھا۔ ان بچیوں کی بازیابی اے ک مشکل امر تھا جس پر حکومتیں بھی بے بس ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں نانا جانی جیسا کھوٹہ سکہ کام آے ا۔ ان بچیوں کو پاکستان لانا اور ان کے ورثا کو پاکستان لانا اور ان کے ورثا سے ملانا نانا جانی نے اپنا مشن بنالے ا۔

1947ء سے 1955ء تک نانا جانی نے کم و بیش پچاس دفعہ بارڈر کراس کے ا اور ہر بار پانچ سے لے کر پندرہ بچیوں کو پاکستان لا کر ان کے ورثا کے حوالے کے ا۔ ان کا یہ کارنامہ یقینا بہت سے نام نہاد سے استدانوں کی سے است پر طمانچہ رسید کرتا نظر آتا ہے۔

نانا جانی ہر چکر میں بھیس بدل کر مشرقی پنجاب جاتا۔ کبھی مدارس بن کر، کبھی بہروپیا بن کر کبھی سادھو بن کر۔ ہر علاقے میں بنجاروں کی طرح گھومتا رہتا۔ جہاں کہیں بھی کسی مسلمان لڑکی کی اطلاع ملتی کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ کر ہی لیتا اور اس کی واپسی کی راہ ہموار کرتا۔ جب پانچ، سات لڑکے ان اسکی دسترس میں آجاتیں تو انھیں فورا پاکستان پہنچانے کی سبیل کرتا۔ آج نانا جانی پاکپتن کے اے ک نواحی گاؤں کے قبرستان میں محو استراحت ہے۔

☆☆☆☆

ملک میرا ملکِ پاکستان ہے

ارسلان اللہ خان

ہر طرح سے جو عظیم الشّان ہے
ملک میرا ملکِ پاکستان ہے

اس کے دریا، اس کی جھیلیں، آبشار
دل لبھاتے ہیں مناظر بے شمار

کس طرح رب کا کریں ہم شکریہ
اس نے ہم کو ہے سمندر بھی دیا

اس کے لالہ زار اور اس کے چمن
خوب صورت اس کے ہیں کوہ و دمن

اس کے صوبے اور موسم چار ہیں
لوگ اک دوجے سے کرتے پیار ہیں

ملک ہے میرا محبت کا جہاں
یاخدا اس میں رہے امن و اماں

کس قدر اللہ کی ہیں رحمتیں
جابجا اس میں بنی ہیں مسجدیں

طفل ہیں اچھے، اکابر خوش خصال
ہر جواں اس کا ہے شاہیں کی مثال

یہ تصدق ہے رسولِ پاک کا
مومنو! اسلام کا ہے یہ قلعہ

ارسلان سب خوش رہیں اس کے عوام
اس کی خوشیوں کو مرا رب دے دوام

"لاوارث خط"

بہرام علی وٹو

حسن ڈاکیا فجر کی نماز سے فارغ ہوا تو چہل قدمی کرنے کے لیے قریبی باغ کی طرف چل دیا۔ چہل قدمی کرتے ہوئے رات والا خواب یاد آگیا۔ یہ خواب بہت عجیب تھا۔ اس نے یہ وہمی خواب ہی سمجھا۔ وہ گھر آیا تو کنیز بانو کو ناشتہ دینے کے بعد اس کے انتظار میں تھی۔ کیونکہ حسن آج معمول سے کوئی بیس منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔ کنیز نے حسن کے آتے ہی اسے کہا۔ "کہاں رہ گئے تھے یہ جانتے ہو کہ آپ نے بانو کو کالج چھوڑنا ہے۔ اب جلدی سے ناشتہ کیجیے اور چھوڑ کر سیدھا ڈیوٹی پر نکل جانا۔"

حسن نے کہا۔ "بس مجھے آج ذرا چہل قدمی کرتے دیر ہو گئی۔ اب کچھ بڑھاپے کا اثر بھی ہے۔ بس سال بعد تو ریٹائرڈ ہو جانا ہے۔ پھر ساری وقت اپنی بچی کی خدمت ہی کرنی ہے۔"

وہ بانو کو چھوڑ کر زیڈ بلاک کے ڈاک بکسہ سے ڈاک نکالنے لگا۔ تبھی ایک خط اسے اس ڈاک میں سے ملا۔ جس پر انوکھی بات یہ تھی کہ نہ تو لکھنے والے کا نام لکھا ہوا تھا اور نہ ہی بھیجے جانے والے کا پتہ۔ حسن کی پوری ملازمت میں ایسا خط اسے نہیں ملا تھا۔ وہ تمام ڈاک لے کر ڈاکخانے پہنچا۔ اس نے وہ خط ڈاک خانے کے انچارج کو دیکھایا اس انچارج نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا تو وہ خط قائد اعظم کے نام تھا۔ جس پر تحریر کچھ یوں لکھی ہوئی تھی۔

"ملک پاکستان کے قائد تم نے ہمیں ایک آزاد ملک تو دیا جس پر ہم آپ کے انتہائی شکر گزار ہیں لیکن آج اس ملک کا غریب باشندہ بہت مشکل حالات میں ہے وہ ایک وقت کی روٹی اور پانی جیسی بنیادی ضرورت سے ترس رہا ہے۔ یہ خط آپ کے نام ہے کہ آپ آج کے حکمرانوں کو باور کروادیں کہ یہ ملک کس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا کیونکہ وہ پاکستان کے حصول کا اصل مقصد بھول چکے ہیں۔"۔ حسن کو رات والے خواب کی سمجھ آچکی تھی کہ وہ قائد اعظم تجھے جو کہہ رہے تھے کہ ایک خط تمیں موصول ہو گا وہ مجھے ضرور پہنچا دینا لیکن حسن کو زیادہ اچنبھا تب لگا جب انچارج نے خط پڑھ کر اسے پھاڑ دیا کہ کسی پاگل نے خط لکھا ہے۔ حسن نے خط کے ٹکڑے اٹھا کر قائد مزار پر رکھ دیئے۔ جو ہوا کے ساتھ اڑ کر ادھر ادھر پھیل گئے۔ صفائی والے نے کوڑادان میں وہ ٹکڑے پھیک دیئے۔

انوکھا جشن

ثمرین مسکین، اٹک

رات کے بارہ بجے گلیوں، سڑکوں اور بازاروں سے ایک شور اٹھا اور جشنِ آزادی مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کئی شہروں میں کیک کاٹنے کی تقاریب منعقد کی گئی تھیں۔ کہیں سڑکوں پر موٹر سائیکل سواروں نے ریس لگائی ہوئی تھی۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے پر زوردار ہوٹنگ کی جارہی تھی اسکے ساتھ ہی بے ہنگم قہقہوں نے فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔ بازاروں میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا خاصا رش تھا۔ جھنڈیاں اور سبز ہلالی پرچم کے علاوہ دیگر سجاوٹی اشیاء خریدی جارہیں تھیں۔

بچیوں نے سبز اور سفید رنگ کی چوڑیاں خریدیں، ہر طرف جشن آزادی مبارک کی گونج تھی۔ ایک کونے سے وطن کی مٹی گواہ رہنا کی آواز گونج رہی تھی تو دوسرے کونے سے شکریہ پاکستان کی آواز بلند تھی اور کہیں سے یہ وطن تمہارا ہے کی آواز کبھی مدہم اور کبھی بلند سنائی دے رہی تھی۔ گویا جشنِ آزادی کو خوب جوش و خروش سے منایا جارہا تھا۔ دین محمد نے چھت پہ کھڑے ہو کر یہ نظارہ دور سے دیکھا تھا۔ پاکستانیوں کا جشنِ آزادی کا دن منانے کا طریقہ اسے غمگین کر رہا تھا۔ دین محمد نے اپنے دل میں اٹھتے درد کی شدت کو کم کرنے کیلئے سرخ ہوتی آنکھوں کو اپنی آستین سے رگڑ ڈالا۔ وہ تکلیف کی اس شدت کو محسوس کرتے ہوئے ماضی میں چلے گیا جہاں جگہ جگہ لاشیں بکھری پڑی تھی، کہیں خون آلود پھٹے کپڑے تھے، کہیں بلکتے بچے، کہیں عصمتیں لٹاتی بہنیں اور بیٹیاں تو کہیں روتے بچوں کے گلے گھونٹتی مائیں، کہیں پہ جانوں کا نذرانہ پیش کرتے بوڑھے، جوان اور بچے۔ دین محمد نے ماضی اور حال کا موازنہ کیا تو انہیں اپنا آپ بے حس لگا۔ اپنے ارد گرد لوگ بھیانک لگے۔ دین محمد نے حال میں ایک دفعہ پھر طائرانہ نظر دوڑائی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ہمارا جشنِ آزادی کیسا ہے؟

ہر گھر کی چھت پر لہراتا سبز ہلالی پرچم، ہر گھر کے اندر لہراتی جھنڈیاں، گاتے، بجاتے اور ناچتے، بانکے دل میں ایک بار پھر درد کی ٹیس اٹھی۔

انہوں نے سوچا کیا یہی ہے اس ملک کی قیمت۔؟ اس ملک کیلئے دی گئی قربانیوں کی قیمت۔؟

دین محمد مسلسل ماضی اور حال کا موازنہ کر رہے تھے۔ درد ان کی آنکھوں سے سیال بن کر بہہ رہا تھا۔ تنہا کھڑے اپنے ملک کی سلامتی کی اللہ سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ جہاں لوگ ہلڑ بازی، شور شرابے میں مصروف تھے۔ وہیں دین محمد الفاظ سے گریہ وزاری کر رہے تھے۔

ابھی کل کی ہی تو بات تھی۔ بانکے گھر میں انکی پوتی اپنے بھائی عدیل کو چودہ اگست کی رات کیک کٹنگ کی تقریب کا بتاتے ہوئے تنبیہ کر رہی تھی کہ دادا جان کو اس تقریب بارے نہیں بتانا۔ ورنہ تو دادا جان کی شرکت سے یوں سمجھو تقریب کا ستیاناس ہو جائے گا۔ دادا جان وہی کئی سال پرانی باتیں واقعات سنا کر بور کر دیں گے۔ پھر خاک مزہ آئے گا۔ عدیل نے اپنی بہن ایمن کو بے یقینی سے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

دادا جان ایمن اور عدیل کو بلانے کیلئے آرہے تھے کہ وہ حصول پاکستان کے لئے دی گئی قربانیوں کو اب کی بار پھر اپنے بچوں کے گوش گزار کر سکیں لیکن ایمن کی اپنے بھائی کو کی گئی نصیحت سن کر انہوں نے بھاری قدموں سے اپنی لائبریری کی جانب قدم بڑھا دیے یہ سوچ کر کہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

انہوں نے لائبریری میں بیٹھ کر قائداعظم کی تصویر کو نم آنکھوں سے دیکھا۔، انہوں نے سکول کا وقت یاد کیا جب وہ سکول میں ماسٹر تھے مطالعہ پاکستان پڑھاتے ہوئے انکی کوشش ہوتی تھی کہ وہ طالبات کو پاکستان کی تاریخ سے آگاہ کریں۔ اس ملک کے لئے دی گئی قربانیوں کو طلباء کے گوش گزار کریں لیکن طلباء انکی باتوں کو دقیانوسی سمجھ کر ان کے موضوع گفتگو بدلنے پر مجبور کر دیتے تھے اور دین محمد چاہ کر بھی انکو اپنے بزرگوں کی قربانیوں کی تصویر نہیں دکھا پاتے تھے۔ دین محمد چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ بس یہ تکلیف اور درد آنسوؤں کی صورت ان کی آنکھوں سے بہہ کر ان کے دامن میں جذب ہو جاتے تھے۔

بے ساختہ ان کے ہاتھ اللہ کے حضور ملک کی سلامتی کے لیے اٹھ جاتے۔

☆☆☆☆

تجدید عہد وفا کا دن

دانیال حسن چغتائی

مجھے فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں۔ یہ وطن میری شناخت، میری پہچان ہے اور دنیا بھر میں میرا مان بھی۔ اس لفظ "پاکستانی" سے میرا وہ رشتہ ہے جو کسی تتلی کا پروں سے، پنچھی کا اڑان سے، اور کسی شخص کا اپنے نام سے ہوتا ہے۔ یہ شناخت میرے آباء نے بڑی تگ و دو، جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے اور اب اسے برقرار رکھنا اور اس پر فخر کرنا میرے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا اپنے آباء کے چھوڑے ہوئے ترکے اور وراثت پر اپنا حق سمجھنا اور صرف میرا ہی کیوں، یہ تو ہر اس شخص کا حق ہے جو اس مملکتِ خداداد میں پیدا ہوا ہے، اور اپنے ساتھ یہ پہچان رکھتا ہے۔

گذشتہ پچھتر سالوں میں اس ملک میں جو نسلیں پیدا اور جوان ہوئی ہیں، ان کی سوچ، سمجھ اور خیالات میں بتدریج کئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن میں یقیناً بڑی حد تک پاکستان کے حالات، مختلف ادوار میں پیش آنے والے واقعات، سیاسی، معاشرتی و معاشی مسائل و صورتحال اور بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی اور روز مرّہ مسائل کا بڑی حد تک عمل دخل ہے۔ آج کی نسل پاکستان سے محبت تو ضرور کرتی ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ان کے خون اور گھٹّی میں شامل ہے لیکن محبت کا وہ جنون اور عشق جو دیوانگی کی حد تک ہمیں اپنے سے پچھلی نسل میں نظر آتا تھا، آج مفقود نظر آتی ہے۔

کسی دانشور کا قول ہے کہ محبت بانی مانگتی ہے، عشق صلے سے بے پرواہ ہوتا ہے، اور پیار دینے اور دیے جانے کا نام ہے۔ اور اگر اس پہلو سے پرکھا جائے تو سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس ملک کو کیا دے رہے ہیں؟ اجتماعی سطح پر یہ سوال اٹھانے سے پہلے آیئے ذرا انفرادی طور پر خود سے یہ سوال پوچھیں۔

ملک بھر میں صفائی، گندگی، اور بلدیاتی اداروں کی نااہلیوں پر تبصرہ کرتے ہم خود بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہیں جو گاڑی میں سفر کرتے ہوئے کھڑکی کھول کر ریپر اور تھیلیاں باہر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ ٹریفک جام میں پھنسنے پر ٹریفک پولیس کو برا بھلا کہتے کہتے ہم خود بھی کئی گاڑیوں کا راستہ روکتے خود پہلے نکل جانے کا راستہ تلاش کرتے

ہیں۔ رشوت کو برا کہتے اور رشوت لینے والے افسروں اور اداروں پر لعنت ملامت کرتے ہم خود بھی ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ یا دیگر کاغذات بنوانے، یہاں تک کہ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی پر (جو کہ سراسر ہماری غلطی ہوتی ہے) چالان کروانے کے بجائے رشوت دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

تعلیم کے معیار اور تعلیمی اداروں میں تفریق پر ماتم کرتے ہم خود اس نظام میں تبدیلی لانے کے بجائے کوچنگ سینٹرز اور پرائیویٹ ٹیوشن کے کلچر کر فروغ دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ بجلی کے بحران پر آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ کنڈا اسسٹم پر اپنے گھروں میں اے سی چلانے اور بجلی چوری کے مرتکب ہونے والے بھی تو ہم ہی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اکثریت میری اس بات سے اتّفاق نہ کرے اور ماضی کے بزرجمہروں، اور ان کی پالیسیوں کے علاوہ ریاست کی نااہلی کو ان تمام مسائل کا سبب قرار دے۔ مجھے اس نقطے سے بھی کلّی اختلاف نہیں کہ یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ بحیثیتِ پاکستانی، ہم سب بھی اپنے قومی اور شہری فرائض سے غفلت کے مرتکب ہوتے چلے آرہے ہیں اور اب تو یہ معاملہ سنگینی کی انتہائی حدوں کو چھونے لگا ہے۔ اور اگر اس غفلت کی بنیادی وجوہات پر نظر دوڑائی جائے تو سب سے پہلی بات جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ہم نے اس ملک کو اپنا سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم انفرادی حیثیتوں میں صرف اپنے گھروں کی چاردیواری کو اپنا سمجھتے ہیں اور اس چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہیے، نہ تو اس میں اپنے کردار کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اسے اہم بنانا چاہتے ہیں۔ ملک کو اپنی ذمہ داری سمجھنا تو دور، ہم نے شاید اسے اپنا ماننا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہر بات کی ذمہ داری دوسروں پر، اداروں پر، معاشرے پر، میڈیا پر، سیاسی رہنماوں پر، اور حکومت پر ڈال کر ہم اپنے فرائض سے غافل کیسے ہو سکتے ہیں۔ مسائل کے حل کی طرف سب سے پہلا اور ابتدائی اقدام تو یہ ہے کہ ہم معاشرے کے اس سیٹ اپ میں اپنے کردار اور اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ اپنے انفرادی کردار کو نبھاتے ہوئے پھر ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس نظام میں کیسے مثبت تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ یہ کہہ دینا کہ "اب اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکتا"، بہت آسان ہے، لیکن اس بگاڑ کو سدھارنے کے لیے پہلا قدم بڑھانا ایک دشوار گزار مرحلہ ہے جو یقیناً بہت ہمت، صبر، اور تحمّل کا متقاضی ہے۔ اور یہ قدم صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جن میں اس وطن سے سچی محبت کا جذبہ ہے، جو اس شناخت اور اس پہچان کو اپنی رگِ جاں سے بھی قریب جانتے ہیں۔

75 واں یومِ آزادی نزدیک ہے تو کیوں نہ اس موقع پر خود سے سوال کریں کہ کیا ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے؟ یا کیا ہم اس پہچان پر واقعی فخر کرنا چاہتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یقین جانیے کہ راستہ صاف اور منزل نزدیک ہے۔ اٹھیے! اور اس یومِ آزادی پر اپنے ملک و ملّت کے ساتھ ساتھ خود سے بھی یہ تجدیدِ عہدِ وفا کیجئے کہ:

"یہ وطن ہمارا ہے، ہم ہی ہیں پاسباں اس کے"۔

حقیقی خوشی

محمد طیب صدیقی۔ جہلم

"تجمل اس بار کتنے پیسے جمع ہوئے؟"گلفام نے پوچھا احمد اور شیراز بھی تجمل کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ تجمل جو ابھی پیسے گن رہا تھا گنتی مکمل کر کے خوشی اور جوش بھری آواز میں بولا۔"اس بار محلے کے لوگوں نے بہت اچھا تعاون کیا اور بیالیس ہزار اور سات سو اسی روپے جمع ہوئے ہیں۔"

اتنی بڑی رقم کا سن کر سب خوشی سے اچھل پڑے اور اپنی اپنی رائے دینے لگے کہ اس بار پورے محلے میں جھنڈیاں لگائیں گے اور گراؤنڈ میں ایک بہت بڑا پروگرام کروائیں گے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شیراز کے والد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور بولے "گلفام بیٹا آپ لوگوں نے جو پروگرام کروانا ہے اس کے خرچ کا ذمہ میں اٹھاتا ہوں بس آپ گلیاں اچھے طریقے سے سجانا کہ آزادی کا جشن مناتے ہوئے ہمیں آزادی کی حقیقی خوشی حاصل ہو اور دل کو سکون ملے۔"

"انکل آپ بے فکر رہیں اس بار ہم ایسی سجاوٹ کرینگے کہ لوگ خوش ہو جائیں گے کہ ہم نے جو چندہ دیا اس کو صحیح طرح استعمال کیا گیا۔"

"چلو پھر انکل بشیر کی دکان پر چلتے ہیں آج ہی سامان لے آتے ہیں اور گلیاں سجانا شروع کرتے ہیں"

شیراز بولا۔۔۔ تجمل نے سارے پیسے شیراز کو تھما دیئے اور سب ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور خوشی خوشی سامان لینے کیلئے انکل بشیر کی دکان پر جا پہنچے۔ مگر ان کی خوشی اس وقت کافور ہو گئی جب انہوں نے دیکھا کہ انکل بشیر خالہ بلقیس کو ڈانٹ رہے ہیں اور اور اپنے پیسوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ خالہ بلقیس بولی "بھائی جی میں آپ کا سارا ادھار چکا دوں گی بس کسی سے زکوۃ کے کوئی پیسے ملنے دیں۔ سارے پیسے دیدوں گی۔ مگر ابھی تو دو کلو آٹا دیں میرے بچے کل سے بھوکے ہیں۔"

"نہیں نہیں میں اب مزید ادھار نہیں دے سکتا۔"انکل بشیر برا اعتنائی سے بولے۔

انکل بشیر کے صاف انکار کے بعد خالہ بلقیس آنسو بہاتی ہوئی گھر کی طرف چل گئیں۔

گلفام, شیراز, تجمل اور احمد ساری باتیں سن کر خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ انکل بشیر کی آواز آئی

"واہ جی واہ۔۔۔۔۔!میں بس آپ لوگوں کو ہی پیغام بھیجوانے لگا تھا کہ میں سجاوٹ کا سارا سامان لے آیا ہوں آکر اپنی پسند کی چیزیں لو تا کہ باقی میں واپس کر آؤں۔"

"بولو کیا دوں۔۔؟"انکل بشیر مسکراتے پوچھ رہے تھے۔

شیراز نے دو پچیس ہزار روپے انکل بشیر کی طرف بڑھائے اور بولا۔"انکل۔۔۔!خالہ بلقیس کا ادھار ہم چکاتے ہیں اور جتنے پیسے انہوں نے دینے ہیں وہ کاٹ لیں۔گھر کیلئے ایک مہینے کا سودا سلف نکال دیں۔"انکل بشیر حیرانی سے شیراز کی طرف دیکھنے لگے اور پھر شیراز کے کہنے پر عمل کرنے لگے۔گلفام اور احمد ایک ساتھ آگے بڑھے اور شیراز کو گلے لگاتے ہوئے بولے "شیراز یار تم عظیم آدمی ہو جس نے بغیر کسی خوف اور جھجھک کے اتنا بڑا فیصلہ کیا اور ایک بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی مدد کرنے کا سوچا۔"

انکل بشیر سے گھر کا سارا سامان لئے چاروں دوست خالہ بلقیس کے دروازے پر پہنچے اور سارا سامان خالہ بلقیس کے دیتے ہوئے کہا"خالہ جان یہ ہماری طرف سے چودہ اگست کا تحفہ۔"

اور پھر باقی پیسے بھی خالہ کو دیتے ہوئے شیراز بولا۔۔۔"خالہ جان معاف کرنا ہمیں تاخیر ہو گئی یہ بات سمجھنے میں کہ گلیاں سجانے سے دل کو خوشی اور سکون نہیں ملتا بلکہ کسی کے آنسو صاف کر کے اس کے ہونٹوں پر مسکان سجانے سے جو خوشی ملتی ہے اور در حقیقت وہی خوشی 'حقیقی خوشی' ہوتی ہے۔"

چودہ اگست کو گراؤنڈ میں ہونے والے جشنِ آزادی کے پروگرام میں لوگوں نے سوال اٹھایا کہ اس بار جو پیسے اکٹھے کئے گئے ان سے گلیاں کیوں نہیں سجائی گئیں؟

"وہ رقم کدھر خرچ کی گئی۔"

اس سوال کا جواب دینے کیلئے گلفام سٹیج پر آیا اور ساری بات بیان کر دی۔

اور کہا کہ "میں معذرت کرتا ہوں کہ جس مقصد کیلئے آپ لوگوں سے رقم کی گئی تھی وہ ہم پورا نہیں کر سکے اور۔۔۔"

ابھی گلفام کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ لوگ سٹیج پر دوڑتے ہوئے چڑھے اور چاروں دوستوں کو کندھوں پر اٹھائے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے محلے کی گلیوں میں چکر لگانے لگے۔جب یہ جلوس شیراز کے گھر کے سامنے پہنچا تو شیراز کے والد صاحب باہر آکر چاروں دوستوں کو گلے لگا کر بولے,۔۔۔"میرے بچو۔۔۔!ابھی جو خوشی آپ کو محسوس ہو رہی ہے ایک بیوہ اور یتیم بچوں کی مدد کرنے کے بعد تو یہی حقیقی خوشی اور دل کا سکون ہے اور آج آپ نے سب لوگوں کو بتادیا کہ حقیقی خوشی گلیاں سجا کر نہیں بلکہ کسی کے ہونٹوں پر مسکان سجانے سے ہوتی ہے۔"

☆☆☆☆

آزادی کا سفر

عبدالحفیظ شاہد۔ مخدوم پور پہوڑاں

آصف والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسی وجہ سے بچپن سے ہی اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ آصف اور اس کے دوستوں نے پاکستان کا پچھترواں جشنِ آزادی شایانِ شان طریقے سے منانے کے لئے یکم اگست سے ہی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ہمارے آباؤ اجداد جشنِ آزادی کے دن کو یومِ تشکر کے طور پر مناتے تھے لیکن آصف اور اس کے دوستوں کی جشنِ آزادی منانے کی تیاری ذرا مختلف تھی۔ انہوں نے یومِ آزادی کا جشن منانے کے لئے اونچی آواز سے موسیقی بجانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ون ویلنگ کے لئے موٹر سائیکل کو بھی سیٹ کروالیا تھا۔

14 اگست کی شام کو آصف اپنے دوستو سمیت ون ویلنگ کر کے کرتب دکھا رہا تھا کہ اچانک اس کا بائیک تیزی سے سلپ ہوا۔ حادثہ اتنا شدید اور اچانک ہوا کہ آصف کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ آصف کو دوسرے دن شام کو جا کر ہسپتال میں ہوش آیا۔ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کہاں ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے سارا کچھ یاد آنے لگا۔ اسے پہلی بار اپنے اس شوق پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ ٹانگ میں فریکچر کی وجہ سے وہ بستر کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات کا قلق ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے معذور ہو گیا ہے۔ اب اس کا فوج میں جانے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اس کی گھر میں سب سے زیادہ دوستی دادا جی کے ساتھ تھی۔ اور وہ بھی سارا وقت آصف کے ساتھ ہی گزارا کرتے تھے۔

ایک دن اس نے دادا جی سے پوچھا کہ "دادا جی جب پاکستان بنا تو آپ کیسے پاکستان پہنچے تھے"؟۔ یہ سوال سنتے ہی دادا جی کہیں دور فضاؤں میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے مخاطب ہوئے۔ دادا جی آنکھوں میں آنے والی نمی کو صاف کرتے ہوئے بولے:

"آصف بیٹا، ہجرت کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ میری آنکھوں اور دل و دماغ سے ان شہیدوں کے چہرے آج بھی اوجھل نہیں ہوتے جن کو پاکستان سے محبت کے جرم میں شہید کر دیا گیا تھا۔ ہم سب گھر والوں کے ساتھ ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہوئے تھے، ساتھ بس تھوڑا بہت ضروری ساز و سامان تھا۔ چلتے چلتے سارا دن

گزر گیا تھا۔ ہر طرف خوف کی ایک فضا تھی۔ وحشت نے ہر جانب ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اچانک ہمارے قافلے پہ سکھوں کے ایک بہت بڑے جتھے نے حملہ کر دیا تھا۔ ایک مکروہ صورت سکھ نے کرپان کو شیر خوار بچے کے ننھے سے پیٹ میں گھونپ دیا۔ خون کا فوارہ نکلا۔ ماں نے بچے کو بچانا چاہا لیکن دوسرے سکھ کی تلوار نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ قافلے کے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگوں نے جان بچانے کی لئے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ بد قسمتی سے قافلہ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک حصے میں ہم دونوں بھائی رہ گئے تھے۔ سارا خاندان قافلے کے دوسرے حصے کے ساتھ جانے کہاں راستہ بھٹک چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ غیر ہموار سامیدانی راستہ اور جگہ جگہ جھاڑیوں اور جابجا شہیدوں کے بکھرے جسدِ خاکی کی وجہ سے چلنا بہت دشوار ہو رہا تھا"۔ دادا جی نے سانس ہموار کرتے ہوئے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"صبح ہوتے ہی ہمارا بچا کھچا قافلہ ایک مسلمان آبادی والے گاوں کے قریب پہنچا۔ گاوں کی فضا دھویں اور لاشوں کے جلنے کی ناگوار سی بو سے آلودہ تھی۔ یقیناً پاکستان کی آزادی کی قیمت ادا کرنے والے ان گمنام جانثاروں کے گوشت کے جلنے کی بو تھی جو محض مسلمان ہونے اور پاکستان سے محبت کے جرم میں جل رہے تھے۔ بہت مشکل سے گرتے پڑتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ منزل تو ہماری ریلوے اسٹیشن تھی جس کی سمت کا نہ کوئی تعین تھا اور نہ ہی اندازہ۔ اچانک ایک سکھوں کی بس نزدیک آکر رکی۔ سکھوں نے گاجر مولی کی طرح نہتے مسلمانوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں بھائی اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خون میں نہا چکے تھے اچانک مجھ پر کوئی گرا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں زندہ ہوں اور لاشوں کی نیچے دبا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنا سر اور چہرہ نکالا۔ منہ، ناک اور آنکھوں میں شدید اذیت ناک جلن ہو رہی تھی۔ چھوٹا بھائی بھی ایک لاش کے نیچے نیم بے ہوشی کی حالت میں دبا ہوا تھا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ کچھ لوگ زخمی تھے اور چلنے پھرنے سے قطعی معذور بھی تھے۔ ہمیں دیکھ کر زخمیوں نے پانی مانگا۔ ہم نے قریبی کھیت میں کھڑے پانی میں قمیض ڈبو ڈبو کر ان زخمیوں کے منہ میں نچوڑا لیکن پانی پیتے ہی کئی زخمی آخری ہچکی لیکر شہید ہو گئے۔ ظالموں نے شائد کھڑے پانی میں بھی زہر ڈالا ہوا تھا"۔ یہ سب بتاتے ہوئے دادا جان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے پھر بھی وہ مسلسل بول رہے تھے۔

"جانے کیسے گرتے پڑتے ہم پختہ روڈ تک پہنچے تھے۔ وہ شائد قیامت کا دن تھا۔ ہر انسان پریشانی کا شکار تھا لیکن ایک عشق تو سانجھا تھا ناں؟ مملکتِ خداداد کا عشق۔ اسلام کے قلعے کے حصول کے لئے دعائیں اور اس پاکیزہ مٹی کی کشش تو سانجھی تھی ناں آصف بیٹا؟"

دادا درد ناک آواز میں بولتے جا رہے تھے۔ آصف مبہوت ہو کر ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی خوفناک مووی دیکھ رہا ہو۔

"ہم لوگ اس قافلے سے بھی بچھڑ چکے تھے جس میں صرف کچھ بچے کھچے لوگ ہی بچے تھے۔ ہماری حالتِ زار دیکھ کر راستے میں ایک بیل گاڑی پہ سوار ایک بزرگ خاتون نے ہم دونوں بھائیوں کو سمٹ کر جگہ دی۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر ٹرین لاہور کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ٹرین کی کسی بوگی میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ چھتوں پر بھی سوار تھے اور بڑی تعداد میں ٹرین کے ساتھ بھی لٹکے ہوئے تھے۔ راستے کے مناظر سے صاف پتا چلتا تھا کہ امرتسر میں کافی قتل و غارت ہو چکی تھی۔ ٹرین کے سب مسافر حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ سب لوگ بس ایک دفعہ پاکستان کی ہوا میں سانس لینا چاہتے تھے۔ امرتسر سے اٹاری کا آدھے گھنٹہ کا سفر ٹرین نے رک رک کر کئی گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ راستے میں کئی جگہ ٹرین کے مسافروں پر حملے کی بھی کوششیں ہوئیں۔ اٹاری اسٹیشن سے ذرا آگے ایک ظالم سکھ کی تلوار سے میرا چھوٹا بھائی شہید ہو گیا اور میں بد نصیب کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹرین کی سیٹ کے نیچے چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔

ٹرین چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہی تھی۔ ٹرین چلتے چلتے بالآخر لاہور میں داخل ہو ہی گئی جو ہجرت کرنے والوں کا پہلا پڑاؤ تھا۔ قافلے کے بچے کھچے لوگ لاہور اسٹیشن پر اترتے ہی سجدے میں چلے گئے۔ لوگ لاہور کی مٹی کو ایسے چوم رہے تھے جیسے حاجی غلافِ کعبہ کو چومتے ہیں۔"

یہ واقعات سناتے ہوئے دادا جی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ آصف کو زندگی میں پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا کہ قیام پاکستان کے وقت مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہوا، بزرگ اسے یاد کر کے آج بھی کیوں آہیں بھرتے ہیں۔ کیسے سکھ سے جی سکتے تھے وہ لوگ جن کے سامنے ماؤں اور بہنوں کی عصمتوں کا جنازہ نکلا، کتنا حوصلہ ہو گا ان ماؤں کا جن کے سامنے بچوں کو تلواروں میں پرویا گیا، جانے کیسی بلند حوصلے کی چٹانیں ہوں گی وہ بیویاں جن کے سامنے

ان کے سہاگ ذبح کیے گئے ہوں گے اور کتنا بلک بلک کے روئے ہوں گے وہ بیٹے جن کے سامنے ان کے باپ کا سر تن سے جدا کیا گیا ہو گا۔ وہ روئیں نہ تو کیا کریں؟

دیکھو بیٹا یہ سب قربانیاں محض ایک ملک کے لیے نہیں تھی بلکہ یہ قربانیاں آنیوالی نسلوں کو اسلام کا قلعہ فراہم کرنے کے لئے تھیں۔ یہ ملک ہمارے آباؤ اجداد کی انتھک محنت اور بے مثال قربانیوں کا ثمر ہے جو ہمیں ملک پاکستان کی صورت میں عطا ہوا ہے اور ہمیں اپنے ملک پاکستان کی قدر کرنی چاہیئے اس لئے کہ لاکھوں لوگوں نے اپنی جانوں کے نذرانے دے کر اس ملک کی آبیاری کی ہے۔

"آصف بیٹا! اس ملک کی بنیادوں میں بہت سے شہداء کا خون شامل ہے۔ اب یہ آپ جیسے جوانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پاکستان کو صحیح معنوں میں پاکستان بنانے کے لیے دن رات محنت کریں، تحریک پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے رہنماؤں اور کارکنوں کی روحوں کو ابدی راحت و تسکین پہنچانے کے لئے اپنی آنے والی نوجوان نسلوں کی دنیا اور آخرت سنوارنے کے لئے ملک پاکستان کو دین اسلام کا گہوارہ بنانے کے لئے دن رات انتھک محنت کریں۔ اس ملک کو انہی بنیادوں پر پھر سے استوار کریں اور اپنے قائدین کی قربانیوں کو خراج تحسین پیش کرنے کا واحد زریعہ ہے کہ اس کے استحکام اور ترقی کے لیے کام کریں اور اپنی آنے والی نسل کو اس ملک کے قیام کی جدوجہد اور اس میں دی جانے والی قربانیوں سے روشناس کرائیں۔ انشااللہ ہمارا ملک تا قیامت قائم و دائم رہے گا پاکستان زندہ باد۔ آصف کو یوم آزادی اور جشنِ آزادی کا مفہوم آج مکمل طور پر سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆☆

اصل آزادی

مریم اقبال

"یار حد ہوتی ہے... آخر پاکستان اور انڈیا کو الگ ہی کیوں کیا گیا جب ایسے ہی پاکستان کا حال ہونا تھا...." وقاص نے چڑ کر کہا۔ "وقاص جو بھی ہے مگر تم اس طرح پاکستان کے خلاف کچھ بھی نہیں کہہ سکتے...کیسے پاکستانی ہو یار تم جو اپنے ہی وطن کو اس طرح کہہ رہے ہو..." زبیر نے ناگواری سے وقاص کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو یار مانا کہ ہم پاکستانی ہیں مگر آخر اس وطن نے ہمیں دیا ہی کیا ہے؟....نا عزت نا شہرت.... کہیں پاکستان سے دور کسی دوسرے ملک چلے جاو تو جب ان کو بتاو کہ ہم پاکستانی ہے تو اتنا حیران ہو کر دیکھتے ہیں...اوپر سے لے کر نیچے تک ایسے جانچ رہے ہوتے ہیں کہ اپنا آپ گناہ گار لگ رہا ہوتا ہے.....بات کرتے ہو پاکستان پر فخر کی...." وقاص غصے سے پیر پٹختا زبیر کی بات سنے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا۔

زبیر بس نا میں سر ہلا کر رہ گیا.....وہ بھی گھڑی پر وقت دیکھتا وہاں سے گھر کو روانہ ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم دادا جی!....کیسے مزاح ہیں آپ کے...؟"

زبیر گھر کے اندر داخل ہونے ہی لگا تھا کہ سامنے وقاص کے دادا جو اکثر مغرب کے وقت اپنی کرسی دروازے کے باہر رکھ کر بیٹھے تسبیح پکڑے ہوئے اذکار میں مشغول ہوتے تھے...اپنے گھر کے رخ کو چھوڑ کر دادا کے پاس آکر عاجزی سے سر جھکا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام....زبیر پتر اللہ رب العالمین دا کرم اے (زبیر بیٹے اللہ رب العالمین کا کرم ہے)..."

وہ زبیر کے سر پر پیار دیتے بتانے لگے..."تم سناؤ تمہارا کیا حال ہے؟"

"الحمد اللہ دادا جی....دادا جی ایک بات بتائیں....کیا آپ نے پاکستان آزاد ہوتے دیکھا ہے؟"

"ہاں پتر...جب بھی وہ وقت یاد آتا تو دل درد سے پھٹنے لگ جاتا ہے....." دادا کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے یہ کہتے ہوئے. "لیکن پتر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟.." دادا ابو نے اپنی آنکھوں کی نمی کو انگلیوں کے پوروں سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

زبیر نے آج وقاص سے ہوئی ساری بات دادا جی کو بتادی۔

"چل صحیح پتر میں دیکھ لیتاہوں مگر مجھے بڑا رنج ہوا یہ سن کر....."اتنے میں زبیر کی والدہ دروازے پر کھڑی زبیر کو آوازیں لگانے لگی۔

چل پتر تیری اماں تجھے بلا رہی ہے۔

"آ گئے ہو.....نا گھر کی فکر نا اپنی پڑھائی کی اور اوپر سے اب اگست کا مہینہ بھی ہے اور پر سوں جشنِ آزادی ہے سامان بھی لینا ہے.... لیکن مجال ہے یہ لڑکا گھر پر ہو..."رضیہ بیگم دستر خوان پر بیٹھی وقاص کے صبح سے اب گھر آنے پر غصہ سے وقاص کے والد کو شکایت لگانے لگی۔

"ماں ہزار بار کہا ہے آپ کو میں نے یہ جشن وشن کی باتیں نا کیا کریں میرے سامنے پتا نہیں کیوں آپ کو یہ ملک اچھا لگتا ہے...... گالی لگتا ہے مجھے یہ سب........"وہ کہتا ہوا غصے سے نوالہ پھینکتا اپنے کمرے کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ دادا ابو کی آواز پر رک گیا۔

"تو پتر کیا ہم بھی پھر گالی لگتے ہیں تجھے؟".....

"دادا ابو یہ آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں؟.... ایسے نا کہیں..."وقاص فوراً دادا کے پاس آیا اور ان کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"نا پتر تو نے اپنی ماں کو کہا کہ تجھے پاکستانی لفظ گالی لگتا ہے.... یہ دھرتی یہ وطن میری ماں ہے اور تو ان کو گالی دیے تو میں سمجھو مجھے دی ہے۔"

وقاص شرمندہ ہوا......"چل پتر آج تجھے بتاتا ہوں وہ راز جو آج تک میں نے تیرے باپ کو بھی نہیں بتایا.. کبھی اس نے ایسا کیا ہی نہیں جو مجھے بتانا پڑتا مگر آج شاید اگر نا بتا پایا تو میں اپنے آپ سے بھی نظریں نا ملا پاو□ ں گا...

گھر کے سب افراد چھوٹے بڑے سب دادا کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"یہ اس سن کی بات ہے جب قائد اعظم نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کی بات رکھی تھی۔

"اماں ابا آخر آپ لوگ سمجھ کیوں نہیں رہے ہم مسلمانوں کو اب ایک الگ ریاست کی ضرورت ہے......ہندوستان ہم مسلمانوں کے لئے ایک الگ سوچ رکھتا ہے ہم آزادی سے جی نہیں سکتے اپنی عبادت نہیں کر

سکتے آزادی سے, ہم اپنے تہوار ایسے نہیں منا سکتے جیسے یہ سب مناتے ہیں... ابا اماں آپ لوگ کیوں غلامی میں ہی رہنا چاہتے ہیں؟"۔

"اوبد بخت منہ بند رکھ اگر آس پاس کے لوگوں نے سن لیا نا تو یاد رکھ زندہ جلا دیں گے..... اور ویسے بھی یہاں ٹھیک ہے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں..... اور اب میں تیری کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا وہ کہہ کر اپنی آرام گاہ جا چکے تھے..." "اماں آپ بھی..... بس خالد پتر میں بھی کچھ نہیں کر سکتی اگر میں تیرے ساتھ ہوتی تو پتا تیرا باپ مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کرے گا۔ کیا تو چاہتا کہ اس عمر میں جہاں تین جوان بیٹیاں اور دو جوان بیٹے ہوں میں طلاق لوں؟

خالد بھی یہاں آ کر بے بس ہو جاتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا اپنے باپ کو انہوں نے کہا ہے تو کر کے دیکھا بھی دیں گے۔

وقت بیتا گیا میں بھی بڑا ہو گیا میں 20 کی عمر کو جب پہنچا تو خالد بھائی مجھ سے ملنے آ رہے تھے..... خالد بھائی حیدر آباد میں کسی دوست کے ساتھ وہاں رہائش پزیر ہو گئے تھے..... پھر میں ہی وہاں اماں ابا کے ساتھ رہنے لگا.... ابا نے بھائی کو نکال دیا تھا کیونکہ لاکھ سمجھانے کے باوجود بھائی نے قائد اعظم کا ساتھ نا چھوڑا..... وہ سن 1947 کا تھا وہ خوش خبری دینے آ رہے تھے پاکستان کی آزادی کی ابا بھی خوش تھے مگر وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے وہ ڈرتے تھے.... ان سرپنچوں سے.... گھر میں سب خوش تھے بھائی کی آمد اور فتح کا سن کر

اماں بیسن کے لڈو زیادہ بنانا دونوں مل کر کھائیں گے..... سن شوکت کی ماں اگر تو یہاں خالد آیا تو میں وہ کروں گا جو تو نے سوچا بھی نہیں ہو گا.....

ماں نیچے منہ کر کے ڈوپٹہ سے اپنے آنسو صاف کرنے لگ گئی.. میں غصے میں ابھی بولنے ہی لگا تھا کہ اچانک بہت ساری آوازیں آنے لگ گئی..... بیچ میں اچانک بھائی کی زور دار چیخ کی آواز آئی تو میں ابا کو دیکھتا فوراً بھائی چلاتا باہر کو بھاگا..... ابا بھی میرے پیچھے آئے جب دروازہ کھولا تو دیکھا کہ خالد بھائی خون سے لت پت پڑا تھا... ان کا بائیں بازو کٹا پڑا تھا تکلیف سے تڑپ رہے تھے..... مگر وہ ظالم لوگ.... ذرا ترس نا آیا ان کو..... بھائی تکلیف میں بھی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگائے جا رہے تھے۔

لگتا ہے یہ نہیں مانے گا اس کی زبان بند ہی نہیں ہو رہی۔ اس کی زبان کاٹ ڈالتے ہیں بڑے پنکھ نکل گئے ہے اس کے ہمارے ہندوستان کو دو ٹکروں میں تقسیم کرے گا..... وہ پانچ دس کی تعداد میں ظالم بھائی کی زبان پکڑ کر تلوار سے وار کرنے ہی لگے تھے کہ ابا نے آکر اپنا ہاتھ اس تلوار کے نیچے دے دیا... ابا کا ہاتھ الگ ہو کر بھائی کے بالکل منہ کے پاس گرا اور ابا کے ہاتھ سے خون کا فوارہ بہنے لگا.... میں نے زور کی چیخ ماری..... تو سارے پہلے ابا کی طرف پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

بھائی پہلے تو ابا کا یہ ردِ عمل دیکھ کر حیران ہوا پھر جب میری آواز سنی اور پھر ان سب کو دیکھا جن کی نظریں گھر کے اندر جھانک رہی تھی.....

شوکت جاااا..... اندر جاااااایہ..... بہنوں..... کو..... نہیں..... چھوڑ..... یں..... گے..... جا.....

میں فوراً اپنے حواس میں لوٹا تو اندر کو جیسے ہی گیا تو پیچھے سے وہ سب اندر آنے کے لئے دروازہ توڑنے لگے..... اور بھائی اور ابا کی چلانے کی آوازیں آنے لگی....

میں فوراً اندر آیا ان کو لے کر میں ابھی دوسری دیوار سے جانے کے لئے آگے کو گیا تو دیکھا ہر طرف سے وہ سب لوگ ہاتھوں میں تلواریں لئے دیواریں پھلانگ اندر کو آرہے تھے..... میں نے فوراً ان تینوں کو اور ماں کو اندر کمرے میں بند کر دیا۔

بیٹا... لگتا ہے اب ہماری مہلت ختم ہونے کو ہے..... تو یہ دیکھ رہا ہے.... ماں نے اپنی چنری آگے کر کے کہا.... میں بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ ماں کیا کہہ رہی ہیں۔

آج ہم اپنی عزت کے لئے جو کریں گی پتر تو ڈر نا مت اگر تو ڈر گیا تو پتر تو یہی مر جائے گا.... تجھے جینا ہے ابھی.... تجھے لڑنا ہے.... ہم بزدل بنے رہے تو نے نہیں بننا... دروازے پر زور زور سے دستک ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی دروازہ ٹوٹ جائے گا.....

ماں میں سمجھ رہا تیری بات کو میں اپنی باجیوں اور تیرے کو یہاں سے لے جاوں گا۔ میں بار بار دروازے پر زور دے کر اماں اور باجیوں کو دیکھ رہا تھا مگر مجھے ان کی آنکھوں سے نکلتے آنسو اور ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ حیران کر رہی تھی کہ موت پاس ہے اور یہ ہنس رہی ہیں.... میں سر جھٹکتا پھر دروازے پر زور لگانے لگ گیا کہ ٹوٹ نا جائے...

اچانک مجھے جلنے کہ بو آنے لگی.... میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا...ماں نے خود کو اور تینوں باجیوں کو آگ لگا دی تھی... میں یہ دیکھتا رہ گیا.....ماں یہ تو نے کیا کیا.....ماں.....سب چلانے لگی.....جل رہی تھی.....ماں نے جلتے جلتے کہا.....پتر یہ سب وطن پاکستان کی نسل پر ادھار ہے.....اگر آج یہ نا کرتے ہم تو تیری بھی موت ہونی تھی.....اور ابھی تجھے جینا ہے۔

پھر سب کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی. آہ.....وہ آوازیں.....میں آج بھی سوچوں تو لگتا کہ یہ ابھی کی بات ہے...پھر آہستہ آہستہ باہر سے آوازیں آنا بند ہو گئی....ان کو بھی پتا لگ گیا کہ انہوں نے خود کو جلا دیا ہے اور ان کو لگا کہ میں بھی ان کے ساتھ جل گیا.....پھر اچانک خاموشی ہو گئی....میں تو ان کی موت کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا.....جب رو دھو کر ہمت کر کے باہر آیا تو صحن میں ابا اور بھائی کا جسم پایا.....دونوں کے سر تن سے جدا..... ہر اعضا تن سے جدا کر کے ادھر ادھر پھینک دیا.....میں وہی مرنے والا ہو گیا تھا کہ...اچانک پورے گھر کو میں نے آگ میں لپٹا دیکھا.....آس پاس کے شور کی پروا نہیں تھی.....میں تو اپنی ہنستے گھر کو شمشاد بنا دیکھنے لگا. میرا دل کیا میں بھی اسی آگ میں جل جاؤں....میں بھی وہی لیٹ گیا اور پھر ماں کی آواز گونجی...تجھے جینا ہے.....یہ سب وطن پاکستان کی آئندہ نسل پر ادھار ہے۔

ماں کی آواز تھی کہ کیا میں برق رفتاری سے آگ پھلانگتا وہاں سے نکل گیا.....میں پھر رستے میں رکا نہیں.....ہر طرف وحشت پھیلی ہوئی تھی ہر طرف چیخ و پکار.....کہیں لوگ اپنے گھروں کو اپنے عزیزوں کو جلا کر میری طرح بھاگ رہے تھے کہیں زیادتیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا مگر میں رکا نہیں.....رکتا کیسے ماں کی آواز نے رکنے ہی نہیں دیا۔

اور دیکھو آج تم لوگوں کے سامنے ہوں.....سب کی آنکھیں نم تھی...یہ قربانیوں کے قصے تو کتابوں اور باہر سے سنتے آرہے تھے آج اپنوں کے ساتھ یہ سنا تو دل خون کے آنسو رو رہا تھا....وقاص کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

وقاص پتر تو جو کہہ رہا کہ اس وطن نے کیا دیا....تو یہ بتا تو نے کیا کیا اس وطن کے لئے؟

تو دوسروں پر رکھ کر کیوں اس کی ناکامی کا اندازہ لگا رہا تو خود سوچ اپنے آپ کو پرکھ.....یاد رکھ تجھ پر ادھار ہے اس وطن کی عزت.....تو خود ناکام انسان ہے اسی لئے تجھے یہ وطن ناکام لگ رہا ہے.....ہمیں محبت اس سے اس

لئے ہے کیونکہ وطن نے ہمیں آزادی دی.....خوشیاں دی....یہ تو جب تم جیسے لوگوں کے ہاتھوں یہ وطن آیا تو اس کا یہ حال ہو گیا....یاد رکھنا ہم اور ہمارے بزرگ روزِ حشر اس کا سوال تم سب سے کریں گے...."

"داداجی معاف کر دیں پلیز....مجھے احساس ہو گیا ہے....میں غلط تھا....واقع ہم کیسے کہہ سکتے وطن کو اس طرح جب کہ ہم نے بھی تو کچھ نہیں کیا....."

وہ گلے لگ کر رونے لگ گیا۔

"کیپٹن وقاص آج آپ کو سرحد پر جا کر دشمنانِ وطن سے جنگ جیتنی ہے....."افسر نے ا□±سے حکم دیا۔

"یس سر.."..وقاص سینہ تانے سلوٹ کرتا ہوا باہر کو آ گیا۔

اور اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اس کو کھول کر اپنی انگلیاں اپنے دادا کی تصویر پر پھیرنے لگ گیا....."داداجی آج آپ زندہ ہوتے تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتے.....میں آج پھر اپنے وطن کے لئے کچھ کرنے جا رہا ہوں....."

"او کے سر چلیں؟"

وقاص کے ساتھی پاس آئے تو اس کو کہا وہ فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

'بالکل اس کام میں دیری کیسی؟

چلو پھر چلتے ہیں.....ہو جائے پھر.....سب نے ایک آواز میں اور جوش میں کہا....

پاکستان زندہ باد۔۔۔۔"

☆☆☆☆

آزادی کا جھنڈا

ہانیہ ارمیا

میرے دادا پانچ سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔ مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا۔ انھیں اکثر رنجیدہ دیکھا۔ بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ پھر خاموشی سے وہ ہم سب کے درمیان سے اٹھتے اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیتے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔ دادا ابو کیوں اتنے اداس رہتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ میں جماعت نہم میں آ چکی تھی۔ مگر دادا ابو کی سنجیدگی جوں کی توں رہی۔

سکول میں جشنِ آزادی کا پروگرام تھا۔ میں زور و شور سے تقریری مقابلہ جیتنے کی تگ و دو میں لگی تھی۔ ماما نے تقریر بہت اچھی لکھ کر دی تھی۔ بابا مجھے شام میں تیاری کروا رہے تھے۔ دادا ابو بھی پاس ہی بیٹھے تھے۔ مجھے بغور دیکھتے رہے۔ پھر بابا سے بولے۔ "ہانیہ بالکل تمھاری پھوپھو کے جیسے بولتی ہے۔ ناک نقشہ تو دیکھو۔ بالکل آپی جیسا ہوتا جا رہا ہے۔"

بابا نے ایک گہری نگاہ دادا ابو کے چہرے پہ ڈالی۔ ان کی آنکھ میں نمی اتر آئی۔ بھرائی آواز میں بولے۔ "ابا جی! آپ اسے اپنی آپی ہی سمجھ لیں۔ سمجھیں پھوپھو پھر سے ہم سب کے پاس آ گئی ہیں۔ اپنے بھائی کی محبت میں وہ لوٹ آئی ہیں۔" میں حیرانی سے دونوں کی باتیں سنتی رہی۔ مگر دادا ابو رونے لگے۔ ان کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

اس رات میں دادا ابو کے پاس بے وجہ رات گیارہ بجے تک بیٹھی رہی، جب گھر میں چہل قدمی کچھ کم ہوئی تو ان کے بستر پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ انھوں نے حیران ہو کر دیکھا پھر بولے۔ کوئی کام ہے؟

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

"صبح سکول نہیں جانا تمھیں، جو آج ابھی تک یہاں بیٹھی ہو؟"

"جانا ہے مگر مجھے یہ پہلے بتائیں میں کس کے جیسے لگتی ہو؟ میں نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر سوال کیا۔"

وہ مجھ سے نظر چراتے ہوئے بولے۔ "کسی کے جیسے نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مگر میں ان کے پاو□ ں دبانے لگی اور التجائیہ لہجے میں کہا۔ "بتایئے ناں دادا ابو پلیز۔"

دادا ابو کتنی دیر خاموشی سے پہلے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔

"مجھ سے بڑی میری ایک بڑی بہن تھی۔ بہت پیار کرنے والی۔ وہ مجھ سے چار سال بڑی تھی۔ مگر محبت میں مجھے ماں سے کم نہ لگتی تھی۔ 1947 کو جب پاکستان کی آزادی کا اعلان ہو گیا۔ وہ چودہ اگست کی صبح تھی۔ میں جھومتا گاتا گلی سے ٹہلتا گھر میں آیا۔ تب میں بارہ سال کا تھا۔ آپی کو گلے لگایا اور میں نے کہا؛ پاکستان زندہ باد۔ اور وہ ہنسنے لگی۔ اتنی دیر میں میرا ہم جماعت اکرم بھی آ گیا۔ وہ بولا چل، احمد گلی کا چکر لگا کر آتے ہیں۔ میں نے آپی کو کہا۔ مجھے پاکستان کا جھنڈا بنا کر دو ناں۔ اس نے لمحہ بھر سوچا، پھر اندر کمرے میں جا کر صندوق سے سبز رنگ کا نیا دوپٹہ اٹھا لائی۔ اور اسے قینچی سے کاٹنے لگی۔ پاس بیٹھی چچی بولی۔ ہے ہے رقیہ یہ کیا؟ یہ دوپٹہ تمھارے جہیز کے جوڑوں کا ہے۔ پاگل ہوئی ہے، جو اسے کاٹے جا رہی ہو۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ چچی دوپٹہ پھر بن جائے گا۔ ابھی میرے بھائی کو جھنڈا چاہیے، تو کہاں سے دوں؟ اور یہ تو میرے دوپٹے کا غرور ہو گا۔ جس کے نصیب میں پاکستان کا جھنڈا بننا لکھا گیا۔ اس نے دوپٹے کو کاٹ کر سوئی دھاگے سے فوراً سی کر جھنڈا بنا دیا۔ میں نے اور اکرم نے اسے ڈنڈے پہ لٹکایا اور گلی میں نکل گئے۔ پھر وہ رکے اور بولے۔

"وہ ایسا سفید سبز چاند ستارے والا جھنڈا نہیں تھا بلکہ وہ صرف سادہ سبز رنگ کا جھنڈا تھا۔ میں اسی کو تھامے بڑا خوش تھا۔ کچھ ہی دیر بعد چچا، ابا جی اور گھر کے سارے مرد افراتفری میں آئے اور بولے سامان فٹافٹ باندھو، نکلنا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ آج رات ہماری بستی پہ سکھوں نے حملہ کرنا ہے۔ شام تک ہم سب جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ہم ریلوے اسٹیشن کی جانب رواں دواں تھے کہ یکدم میرا پاو□ ں لڑکھڑا گیا اور میں گر گیا۔ وہ میری ماں جیسی بہن میرے درد پہ تیزی سے مڑی اور بولی۔ کیا ہوا احمد؟ ماں صدقے، ابھی یہ کہنا تھا کہ جانے کہاں سے سکھوں کا ایک گروہ جو اندھیرے میں چھپ کر بیٹھا تھا سامنے آ گیا۔ ہم سب بھاگنے لگے ادھر ادھر۔ میری بہن ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ سب چیخنے لگے۔ بچاؤ، چھوڑو، بھاگو۔ چچی کے بازو پہ گولی آ لگی۔ میری بہن کو وہ اٹھا کر لے گئے۔ ہم روتے رہے، مگر وہ نہ رکے، اور اگلی صبح اسٹیشن کے پاس بہن کی لاش ملی۔ بنا کپڑوں کے۔ میری بہن کا مردہ جسم بے آبرو سرِ عام پڑا تھا۔ دادا ابو کے آنسو بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ میں نے، ابا جی، چچا جان نے اپنی

قمیضیں اتار کر آپی کا مردہ جسم ڈھانپا۔ اماں صدمے سے حواس کھو بیٹھی تھی اور پھر کبھی ان کے حواس بحال نہ ہوئے تھے۔ میں آپی کے مردہ جسم سے لپٹا اسے واسطے دیتا رہا کہ اٹھ بہن چلیں پاکستان۔ وہاں ایسا نہیں ہو گا۔ مگر میری بہن نہیں اٹھی۔"

دادا ابو نے چہرے کے آنسوؤں کو کانپتے ہاتھوں سے پونچھا۔ پھر بولے۔ "سفر رک نہ سکتا تھا ہم سب ٹرین کے آتے ہی آپی کی لاش کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہیں درندوں کی زمین پہ چھوڑ آئے۔ لٹتے لٹاتے، سفر کی صعوبتیں سہتے پاکستان پہنچے۔ چچا نے سرزمینِ پاک پہ قدم رکھتے آپی کے دوپٹے سے بنا جھنڈا لہرایا۔ جیسے آپی کو یاد کر کے ا□±س کی قربانی کو عزت بخش رہے ہوں۔ میری بہن کا دوپٹہ آج بھی میرے پاس ہے۔ پھر وہ لرزتے قدموں سے بیڈ سے اترے۔ کانپتے ہاتھوں اور بھیگتی آنکھوں سے انھوں نے الماری کا دروازہ کھولا۔ اور ذرا سی تلاش کے بعد سبز سلک کا جھنڈا نکال لائے۔ وہ جھنڈا انھوں نے اتنا سنبھال کے رکھا تھا کہ بالکل نیا لگتا تھا۔ دادا ابو کی باتیں سن کر میں خود بھی رونے لگی۔ روح تک میں سرسری دوڑنے لگی۔ دادا ابو اپنے اندر کیسا درد چھپا کر بیٹھے ہیں۔ ان کی سرخ آنکھیں یوں تھیں۔ جیسے باعثِ شدید غم ان میں لہو تیر رہا ہو۔ دوپٹہ آنکھوں سے لگا کر وہ پھر رونے لگے۔ میں انھیں چپ کراتی رہی۔ مگر آنسو کا تسلسل رکنے کو تیار نہ تھا۔

اس دن کے بعد میں اکثر دادا ابو سے رقیہ دادی کی باتیں سنتی۔ بہن کی باتیں کر کے کبھی تو ہنستے، کبھی روتے کبھی رنجیدہ ہو کر کمرے میں بند ہو جاتے۔ مگر مجھ سے رقیہ دادی کی باتیں کر کے مطمئن بھی ہو جاتے تھے۔

ان کی وصیت تھی کہ میری میت کو (اس سبز دوپٹے میں لپیٹ دینا۔ بہن کو جا کر دکھاؤں گا کہ اس کا دوپٹہ میں نے کیسا سنبھال کر رکھا ہے اور میرے والد نے ان کی اس آخری وصیت کو پورا بھی کیا۔

☆☆☆☆

عظیم قربانی

صغری یامین لاہور

شام کا غلغلہ تھم گیا تھا اور تمام چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچ گئے تھے۔ رحمن چچا روز کی طرح آج بھی ماضی کے دھندلکوں میں گم تھے۔ انہیں احمد کے آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ اس نے اونچی آواز سے کھنکارا، اس کی آواز سنتے ہی چچا بولے: "کک کون؟"

"یہ میں ہوں چچا! محمد احمد۔" زیادہ رونے کی وجہ سے ان کی بینائی ضائع ہو چکی تھی۔ آج احمد پختہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ وہ ان سے وہ بات ضرور معلوم کرے گا جس کی وجہ یہ حالت تھی۔ احمد نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے ان سے سوال کیا۔ "آپ کی یہ حالت کس وجہ سے ہے؟"

"کیا کرو گے پوچھ کر؟ چچا جان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ مگر احمد کہاں بعض آنے والا تھا۔ وہ اپنی بات پر بضد رہا۔ آخر چچا نے ہار تسلیم کرتے ہوئے وہ واقعہ سنانا شروع کیا:

"پتر! جس رات تقسیم ہند کا اعلان ہوا، ہم سب گھر والے اور دیگر لوگ جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی تھے، تقریباً دو سو افراد کے لگ بھگ تھے، پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ بعد میں سکھوں اور ہندوؤں کو ہماری روانگی کا علم ہو گیا۔ انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ان میں صرف میں اور میری ایک بیٹی فاطمہ ہی زندہ بچی۔ باقی سب کے سب مارے گئے۔ فاطمہ نے مجھے کہا:

"بابا جان! آپ سے ایک عرض کرنا چاہتی ہوں!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو پتر؟" میں نے استفسار کیا تو اس نے ایسی بات کر دی جس نے مجھے ہلا کے رکھ دیا، وہ اپنی معصوم سی پیاری صورت بنا کہ کہنے لگی:

"بابا جان! آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں، میں ہندوؤں کے ہاتھوں نہیں مرنا چاہتی۔ میں عزت کی موت مرنا چاہتی ہوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"بابا جان! میں نے اپنے ساتھ والی لڑکیوں کی عزت سکھوں کے ہاتھوں پامال ہوتی دیکھی ہے۔ میں نے انہیں اپنی

آنکھوں سے انہیں شہید ہوتے بھی دیکھا ہے۔" اس کی غزالی آنکھوں میں موتیوں کی لڑیاں رواں تھیں۔

وہ عزت کی موت مرنا چاہتی تھی۔ اس نے التجا کرتے ہوئے مجھے کہا:

"خدا کیلئے بابا جان! مجھے ختم کر دیں۔ مجھے نہیں لگتا ہم پاکستان صحیح سلامت پہنچ سکیں گے۔"

"احمد بیٹا! میں نے دل پر پتھر رکھ کر اس کی خواہش پوری کر دی۔ اسے زمین پر لٹا دیا، اس کے کندھے پر گھٹنا رکھا اور چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس نے ایک دردناک چیخ ماری اور اس کے بعد زمین پر تڑپنے لگی۔ میں سجدے میں گر گیا۔ جب تک اس کی جان نہ نکلی، سجدے میں پڑا اللہ تعالی سے پاکستان کے استحکام کی دعائیں مانگتا رہا۔" چچا رحمن درد بھری آواز میں بولتے جا رہے تھے۔

"آج جب میں نئی نسل کے قصے سنتا ہوں کہ وہ اغیار کے سحر میں کھو چکے ہیں، تو سوچتا ہوں کیا اس لیے ہم نے اپنوں کو قربان کیا تھا؟ کیا میری فاطمائیں اس دن کے لیے قربان ہوئی تھیں؟"

دور سورج آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتا جا رہا تھا، جب کہ احمد اپنی آستین آنکھوں تک لے جانا بھی بھول چکا تھا۔ چچا عبدالرحمن کی صدائیں اور ان کی لخت جگر فاطمہ کی چیخیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

☆☆☆☆

شانِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

ارسلان اللہ خان

مصطفیٰ کی جان، عثمانِ غنی
منبعِ ایمان، عثمانِ غنی
پیکرِ حلم و سخاوت اور حیاء
جامع قرآن، عثمانِ غنی
آپ ہی امت میں ذوالنورین ہیں
آپ کی یہ شان، عثمانِ غنی
آپ ہی کے ذکر سے معروف ہے
بیعتِ رضوان، عثمانِ غنی
دین کی خاطر لٹایا جا بجا
آپ نے سامان، عثمانِ غنی
ہیں وہی سوئم خلیفہ ارسلان
قاریِ قرآن، عثمانِ غنی

یہ پیارا وطن

آسترِ رندھاوا۔ نیو کراچی

چودہ اگست کا دن قریب قریب تھا۔ مراد یہ سوچ رہا تھا اس مرتبہ اپنے بڑے بھائی مدثر کو کہے گا گھر کے بیرونی دیواروں پہ چھوٹی جھنڈیاں چپکا دے۔

اس کے ہم عمر بھی شوق سے اپنے بھائیوں سے اپنے گھروں کہ بیرونی دیواروں پر لگوا رہے تھے۔ اس کی آرزو تو بڑے جھنڈے کو لگوانے کی تھی لیکن مہنگائی کی وجہ سے اس کے والد اسے گھر کی چھت پہ لگانے کے لئے بڑا جھنڈا لے کر دینے کو تیار نہ تھے۔ ”ارے یار جھنڈیاں لگانے کے بعد میدان میں چلے آنا کرکٹ کھیلیں گے“۔

مدثر سودا ہاتھ میں پکڑے ہوئے رمیز کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اچھا یار“۔ کرسی پہ کھڑے ہوئے رمیز نے گردن موڑ کہ اسے ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا۔

گھر پہنچ کر مدثر نے سودا ماں کہ ہاتھ میں دیا اور بیٹ اٹھاتا صحن سے مین گیٹ کی طرف بڑھا جب اس نے آواز سنی۔

”بھائی جھنڈیاں تو لگا دو“۔ مراد نے ہاتھوں میں جھنڈیاں پکڑے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں بھول گیا تھا۔ لاو□ ز دو“۔ مدثر نے بیٹ کو ایک طرف رکھا اور مراد سے جھنڈیاں لے کر انہیں دھاگے سے چپکانے لگا۔

”بھائی دوسروں کے گھروں کی طرح ہمارے گھر کے باہر بھی جھنڈیاں پیاری لگیں گی“۔ مراد نے چہکتے ہوئے کہا۔

”ہاں مراد صحیح کہہ رہے ہو“۔ مدثر نے دھاگے کو گوند لگاتے مراد کو دیکھتے کہا۔

”بھائی آپ کے دوست تو جھنڈیاں گراتے بہت ہیں۔ انھیں جھنڈیوں کا احترام کرنا چاہیے اس وطن کو لاکھوں شہیدوں نے اپنے خون کے چراغ جلا کے حاصل کیا ہے“۔ مراد نے بہت سمجھداری والی بات کہہ دی تھی جسے سن کر مدثر مسکرا دیا۔

”اچھا میں انہیں کہہ دوں گا“۔ وہ بولا پھر اٹھ کر جھنڈیوں کو گھر کے بیرونی دروازے پہ لگانے لگا۔

☆☆☆☆